راوی فاؤنڈیشن کے زیرِ اہتمام مسلسل اشاعت کا 24واں سال
Monthly
Arxang
Lahore
ماہنامہ
ارژنگ
لاہور
جولائی ۲۰۲۴ء
مدیرِ اعلیٰ:
عامر بن علی
مدیران:
حسن عباسی، لبنیٰ صفدر

CamScanner

کالم نویسی اپنے عہد کی تاریخ کو محفوظ بنانے کا سب سے معتبر طریقہ ہے

تخلیق ہی ادب کا اصل حسن ہے جو عدم کو وجد میں لا کر سرشار کر دیتی ہے

معروف مزاح نگار، شاعر، نقاد، کالم نویس، محقق، ادیب اور استاد

ڈاکٹر اشفاق احمد ورک

سے مدیرِ اعلیٰ ارژنگ، معروف شاعر،

کالم نگار اور سفرنامہ نگار عامر بن علی کی خصوصی گفتگو

مزاح نگاری معاشرے کی گری پڑی جزیات کو پلکوں سے اٹھا کر ہونٹوں پر سجانے کا عمل ہے

ڈاکٹر اشفاق احمد ورک کی تمام زندگی لکھنے، پڑھنے اور پڑھانے کے نیک عمل میں بسر ہوئی ہے۔ یوں تو ان کی شاعری صف اول کے کلام میں شمار کی جاتی ہے اور تحقیق و تنقید کی کتب معتبر حوالے کے طور پر پیش کی جاتی ہیں مگر ان کا حقیقی تخلیقی جوہر مزاح نگاری میں کھلتا ہے۔ ان کی تین درجن کے قریب کتب اب تک شائع ہو چکی ہیں یا پھر اشاعت کے مراحل میں سے گزر رہی ہیں۔ ایک مؤقر روزنامے میں کالم لکھتے ہیں اور ایف سی کالج لاہور میں شعبہ اردو کے استاد بھی ہیں۔ اول درجے کے تکمیل پسند ہیں، اسلوب نگارش میں تحقیقی خنکی اور علمی جرأت رچی بسی ہے۔ تحقیق، تخلیق اور تجزیہ کا ایسا خوبصورت امتزاج عہد حاضر کے کسی اور سخنور کے ہاں ہمیں کم ہی نظر آتا ہے۔

ارژنگ: آپ کا بچپن کہاں اور کیسے گزرا؟ گرد و پیش کے حالات کیسے تھے؟

ڈاکٹر اشفاق احمد ورک: بچپن میں نے روایتی معنوں میں تو دیکھا ہی نہیں ہے۔ میرا گاؤں شیخوپورہ سے بیس کلومیٹر کی مسافت پر حنیف کوٹ ہے، جو کہ میرے دادا کا آباد کیا ہوا ہے اور انہی کے نام سے موسوم ہے۔ ان کے سات بیٹے تھے۔ جن میں میرے والد کا دوسرا نمبر تھا۔ بدقسمتی سے وہ 34 سال کی عمر میں ہی ایک حادثے میں وفات پا گئے۔ میری عمر اس وقت دو، اڑھائی سال کی تھی۔ بچپن کی وہ عیاشی جس کا واحد سہارا باپ ہوتے ہیں، خاص طور پر دیہاتی تمدن میں جہاں شریکہ، برادری کی بھی بہت اہمیت ہوتی ہے، میں بچپن کی اسی عیاشی سے تو محروم ہی رہا۔ بچپن کی شرارتیں مجھ سے چھن گئیں، جن کو میں اب بھی پوری کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ میری مزاح نگاری بھی شائد اسی کوشش کا شاخسانہ ہے۔ ہمارے گاؤں کا پرائمری سکول جہاں سے میں بھی پڑھا ہوں، وہ 1921 میں قائم ہوا تھا۔ میرے دادا کے بھائی ذیلدار تھے، انہوں نے اس سکول کو اپ گریڈ نہیں ہونے دیا، ان کا موقف تھا کہ اس طرح تو شریکوں کے بچے بھی پڑھ جائیں گے اور کمیوں کے بچے بھی پڑھ کر ہمارے برابر آنے کی کوشش کریں گے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ سکول آج سو سال بعد بھی پرائمری سکول ہی ہے۔ میں نے میٹرک شیخوپورہ شہر سے کیا، گاؤں سے میرا نکل آنا معجزہ تھا، چونکہ گزارہ کرنے کے لئے زمینیں تھیں اور ماحول بھی تعلیمی عمل کے لئے درست نہیں تھا، ایف اے اور بی اے کرنے کے بعد میں پنجاب یونیورسٹی لاہور آ گیا جہاں سے ایم اے پاس کیا۔

بقیہ اندرونی صفحات پر

راوی فاؤنڈیشن کے زیرِاہتمام مسلسل اشاعت کا 25واں سال

ماہنامہ ارژنگ لاہور

عالمی سطح پر اردو ادب کا ترجمان

MONTHLY Arzang LAHORE

جولائی 2024 شمارہ 7

مدیرِ اعلیٰ
- عامر بن علی

مدیران
- حسن عباسی
- لبنیٰ صفدر

مجلسِ ادارت
- ڈاکٹر جعفر حسن مبارک
- سعدیہ سیٹھی

مجلسِ مشاورت
- ظفر خان (آسٹریلیا)
- ارشد نذیر ساحل (سپین)

کمپوزنگ: زرناب کمپوزنگ 0321-4730769
فوٹوگرافر: نعمان حسن 0333-4918383
سرورق: لبنیٰ صفدر

پتہ برائے خط و کتابت

ماہنامہ ارژنگ F-3 الفیروز سنٹر غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور
0300-4489310

سالانہ ممبرشپ

ماہنامہ "ارژنگ" کے سالانہ خریدار بننے کے لیے نام اور شناختی کارڈ نمبر پر مبلغ -/1500 روپے بذریعہ موبی کیش رقم بھیجیں اور سالانہ خریدار بن جائیں۔

حسن محمود: 0300-4489310 شناختی کارڈ نمبر: 31204-7298386-9

فہرست

حمد و نعت ، 2

مضامین:
- پھرتا ہے فلک برسوں / ڈاکٹر علی محمد خاں ، 4
- "فکرِ فراواں" پر اظہارِ خیال / نسیم سحر، سرفراز شاہد، ڈاکٹر جعفر حسن مبارک ، 8
- اڈویسی کے اساطیری کردار / شاکر کنڈان ، 11
- برصغیر کا تاریخی، جغرافیائی اور سیاسی منظرنامہ / خاور اعجاز ، 15
- سندھ میں آخری ایام گزارنے والا مغل شہزادہ داراشکوہ / مرزا کاظم رضا بیگ ، 19
- میں وہ "بوٹا" نہیں / ایم بوٹا انجم ، 21
- میرے عہد کا قاسمی: میرا واحد سراج / ڈاکٹر عادل سعید قریشی ، 23
- بیسویں صدی میں اُردو غزل کے عمومی رجحانات / لبنیٰ صفدر ، 25
- مسلمان سائنسی و علمی میدان میں پیچھے کیوں ہیں؟ / ثنا شعبان ، 28
- صنفی برابری میں پاکستان کی حالت / عامر بن علی ، 30

شعری گوشے: ڈاکٹر جنید آذر، مظہر امام، افتخار شوکت ، 31 تا 33

انٹرویو: ڈاکٹر اشفاق احمد وِرک ، 34
- کیوٹو یونیورسٹی اور اورسی ٹومو کمپنی کے خلائی سیٹلائٹ / ڈاکٹر عبدالرحمٰن صدیقی ، 36

انٹرویو: ارشد معراج ، 37

شاعری: ، 41

افسانے:
- روشنی / روبنسن سیموئیل گل ، 45
- دشتِ زندگی / آسناتھ کنول ، 48
- واپسی / محمد شفیق پنوار ، 51
- احساس / انجینئر ظفر محی الدین ، 52
- 53 Amir Bin ali and "Sakura & Spice" Abdul Waheed Bismil
- ادبی خبریں ، 55
- صابر ظفر تو نے یہ کیا کر دیا ہے / اسلام عظمی ، 56

Far East Marketing Co.

Samana Mansion 6.5 Koanp-Minami 1-6-5
Suginami-Ku, Tokyo, 108-0003 Japan
Email: femc1@hotmail.com

حمد و نعت

حمد

کس کا نظام راہ نما ہے اُفق اُفق
کس کا دوام گونج رہا ہے اُفق اُفق
شانِ جلال کس کی عیاں ہے جبل جبل
رنگِ جمال کس کا جما ہے اُفق اُفق
کس کے لیے نجوم بکف ہے روش روش
بابِ شہود کس کا کھلا ہے اُفق اُفق
کس کے لیے سرودِ صبا ہے چمن چمن
کس کے لیے نمودِ ضیا ہے اُفق اُفق
مکتوم کس کی موجِ کرم ہے صدف صدف
مرقوم کس کا حرفِ وفا ہے اُفق اُفق
کس کی طلب میں اہلِ محبت ہیں داغ داغ
کس کی ادا سے حشر بپا ہے اُفق اُفق
سوزاں ہے کس کی یاد میں تائب نفس نفس
فرقت میں کس کی شعلہ نوا ہے اُفق اُفق

حفیظ تائب

نعت

حلقے میں رسولوں کے وہ ماہِ مدنی ہے
کیا چاند کی تنویر ستاروں میں چھنی ہے
کہہ دے مرے عیسیٰ سے مدینے میں یہ کوئی
اب جان پہ بیمارِ محبت کے بنی ہے
محبوب کو بے دیکھے ہوئے لوٹ رہے ہیں
عشاق میں کیا رنگ اویسِ قرنی ہے
گھر سے کہیں اچھا ہے مدینے کا مسافر
یاں صبحِ وطن شامِ غریب الوطنی ہے
معراج میں حوروں نے جو دیکھا تو یہ بولیں
کس نوک پلک کا یہ جوانِ مدنی ہے
اک عمر سے جلتا ہے مگر جل نہیں چکتا
کس شمع کا پروانہ اویسِ قرنی ہے
عشاق سے پوچھے نہ گئے حشر میں اعمال
کیا بگڑی ہوئی بات محبت سے بنی ہے
یادِ احمدِ مختار کی ہے کعبۂ دل میں
مکے میں عیاں جلوۂ ماہِ مدنی ہے
کس شوق سے جاتے ہیں مدینے کے مسافر
محبوبِ وطن سے کہیں یہ بے وطنی ہے
کہتا ہے مسافر سے یہ ہر نخلِ مدینہ
آرام ذرا لے لو یہاں چھاؤں گھنی ہے
آغوشِ تصور میں بھی آنا نہیں ممکن
حوروں سے بھی بڑھ کر تری نازک بدنی ہے
اللہ کے محبوب سے ہے عشق کا دعویٰ
بندوں کا بھی کیا حوصلہ اللہ غنی ہے
آنکھوں سے ٹپکتا ہے مری رنگ اویسی
جو لختِ جگر ہے وہ عقیقِ یمنی ہے
میں اس کے غلاموں میں ہوں جو سب کا ہے آقا
سردارِ رسل سیّدِ مکی مدنی ہے
اعدا نے جہاں مانگی اماں رک گئی چل کر
شمشیرِ حسینی میں بھی خلقِ حسنی ہے
ہر دل میں ہے محبوبِ الٰہی کی تجلی
ہر آئنہ میں عکسِ جمالِ مدنی ہے
مقتل ہے چمن نعش پہ حوروں کا ہے مجمع
کیا رنگ میں ڈوبی مری خونیں کفنی ہے
پہنچی ہیں کہاں آہیں اویس قرنی کی
باغوں میں مدینے کے ہوائے یمنی ہے
کچھ مدح پڑھوں روضۂ پُرنور پہ چل کر
یہ بات امیر اب تو مرے دل میں ٹھنی ہے

امیر مینائی

ظہورِ نور ازل کو نیا بہانہ ملا
حرم کی تیرہ شبی کو چراغ خانہ ملا
تری نظر سے ملی روشنی نگاہوں کو
دلوں کو سوزِ تب و تابِ جاودانہ ملا
خدا کے بعد جلال و جمال کا مظہر
اگر ملا بھی تو کوئی ترے سوا نہ ملا
وہ اوجِ ہمت عالی، وہ شانِ فقر غیور
کہ سرکشوں سے باندازِ خسروانہ ملا
وہ دشمنوں سے مدارا، وہ دوستوں پر کرم
بقدرِ ظرف ترے در سے کس کو کیا نہ ملا
زمیں سے تا بفلک جس کو جرأت پرواز
وہ میرِ قافلہ وہ رہبرِ یگانہ ملا
بشر پہ جس کی نظر ہو، بشر کو تیرے سوا
کوئی بھی محرمِ اسرارِ کبریا نہ ملا
خیالِ اہلِ جہاں تھا کہ انتہائے خودی
حریمِ قدس کو تجھ سا گریز پا نہ ملا
نیاز اس کا، جبیں اس کی، اعتبار اس کا
وہ خوش نصیب جسے تیرا آستانہ ملا
درِ حضور سے کیا کچھ ملا نہ مجھ کو حفیظ
نوائے شوق ملی، جذبِ عاشقانہ ملا

حفیظ ہوشیار پوری

ازل سے نقشِ دل ہے نازِ جانانہ محمدؐ کا
کیا ہے لوح نے محفوظ افسانہ محمدؐ کا
ڈرے کیا آتشِ دوزخ سے دیوانہ محمدؐ کا
کہ اُٹھے شعلے گل کرتا ہے پروانہ محمدؐ کا
ظہورِ حال و مستقبل سے ماضی کو ملا دوں گا
مجھے پھر آج دہرانا ہے افسانہ محمدؐ کا

دوئی ایک داغِ تہمت، غیرتِ الزام بے معنی
وہ دنیا ہے جسے اپنائے یارانہ محمدؐ کا
شفاعت کی دعا میں وہ ہوا دیتے ہیں پر اس کے
جہنم کو بجھا سکتا ہے پروانہ محمدؐ کا
یہاں سے تا بہ جنت روک ہے کوئی نہ پرسش ہے
جہاں چاہے چلا جا، بن کے پروانہ محمدؐ کا
رسائی کب ہے اس تک ہوشِ انساں عقل دری کی
جو اپنی رد میں کہہ جاتا ہے دیوانہ محمدؐ کا
شعاع اس پار شیشے کے، نظر اس پار شیشے کے
جھلک دیکھی کہ پہنچا اُڑ کے پروانہ محمدؐ کا
درودِ اوّلِ سخن ہو آرزو، پھر شعرِ نعتیہ
زباں دھو ڈال اگر کہنا ہے افسانہ محمدؐ کا

حفیظ تائب

منال و مال، نہ سیم و زر و گہر کے لیے
ہے آرزو تو مدینہ کے بام و در کے لیے
درِ حضورؐ کی خاطر، خدا کے گھر کے لیے
میں انتظار میں کب سے ہوں اس سفر کے لیے
سر آسماں کا جھکا ہے ازل سے تعظیماً
بچھی ہے کاہکشاں ان کی رہ گزر کے لیے
کسے نہیں ہے تمنا وہاں کے ذرّوں کی
چلے صبا بھی تری خاکِ رہ گزر کے لیے
میں ان کے اوجِ مقدر پہ رشک کرتا ہوں
زمینِ طیبہ کے ٹکڑے جنہوں نے مر کے لیے
پہنچ سکوں تو وہیں پر لٹا کے سب آؤں
میں ایک اشک بھی چھوڑوں نہ چشمِ تر کے لیے
جو کچھ ہوا ہے تمہارے لیے شبِ اسرار
وہ اہتمام ہوا کب کسی بشر کے لیے
انہیں کے پاؤں کے نیچے کی خاک لے آؤ
جو چاہو چارہ گرو! تم شفا نظر کے لیے

نظر لکھنوی

نسیم ہوتی ہوئی آتی ہے مدینے سے
چمک رہے ہیں گلِ روح پر نگینے سے
کسی سبب سے ہی خورشید لوٹ کر آیا
بحکمِ خاص تھا اور خاص بھی قرینے سے
مرے ستارے کو طیبہ سے کچھ اشارہ ہوا
سو بادباں سے غرض ہے نہ اب سفینے سے
سنا ہے جب سے شفاعت کو آپ آئیں گے
کہ جیسے بوجھ سا اک ہٹ گیا ہے سینے سے
مدینہ ہے تو نجف بھی ہے کربلا بھی ہے
تمام لعل و گہر ہیں اسی خزینے سے

پروین شاکر

زرِ گل ہوئی مری گرد بھی کہ ریاضِ عشقِ رسول ہوں
بڑی پاک خاک ہے یہ گلی میں اسی کی دھول کا پھول ہوں
وہ شہنشہِ عرب و عجم، وہ تہِ فلک حرمِ اُمم
میں انہی کی تیغ تبار ہوں، میں اُنہی کی زرہ فضول ہوں
مرے بادشاہ، مرے بلی، مہ و مہرِ فاطمہؓ و علیؓ
حسنؓ و حسینؓ مرے ولی کہ غلامِ بیتِ بتولؓ ہوں
یہ گُلِ دیارِ علوم ہیں، وہ مہِ رُسل کے نجوم ہیں
یہی نکہتیں مری روح ہیں، میں انہی کے نور کی دھول ہوں
مرا فن خطاؤں کی پوٹ ہے، مرے دل میں نام کا کھوٹ ہے
مری سمت آئی نہ لوٹ کر، میں نگاہِ لطف کی بھول ہوں
مری آنکھ میری ندیم ہے، مری نیند میری گلیم ہے
یہ عطائے ربِ کریم ہے، کہ گدائے روئے رسولؐ ہوں
پسِ نوم بھی درِ باز ہیں، سرِ بابِ خواب دراز ہیں
مری پتلیوں کی ہتھیلیاں کہ فقیرِ بابِ قبول ہوں
مجھے عمر بھر ہے یہ دیکھنا، مرا جسم ہے مرا آئینہ
یہ رضائے رب بہار ہے کہ میں سر بہ جیب، ببول ہوں
مری بے حسی مرے ساتھ ہے، مرے ہاتھ میں مرا ہاتھ ہے
نہ میں اپنے سکھ پہ نہال ہوں، نہ میں اپنے دکھ پہ ملول ہوں
مری گورِ نخلِ چراغ ہو، کہ یہ گورِ خاک پہ داغ ہو
مجھے کیا خبر نہ قبول ہوں، مجھے کیا خبر کہ قبول ہوں
نہ قلندری مجھے زیب دے، نہ سکندری مجھے زیب دے
نہ میں برگِ بیتِ رسول ہوں، نہ میں حرفِ مدحِ رسولؐ ہوں

خالد احمد

آپؐ کا عہد گر ملا ہوتا
میں بھی ہم عصرِ کعبؓ کا ہوتا
مجھ کو جینے کے ڈھنگ آ جاتے
میں بھی اِک پیکرِ وفا ہوتا
زخم جو آپؐ کو اُحد میں لگا
میرے ماتھے پہ وہ کھلا ہوتا
آپؐ جن راستوں سے گزرتے تھے
ان پہ میرا بدن بچھا ہوتا
میں اُتر جاتا کفر کے دل میں
آپؐ کا تیر بن گیا ہوتا
کاش میں بھی لحد کی مٹی میں
آپؐ کے ہاتھ سے ملا ہوتا
ایک انسان دیکھتا میں نجیب
اور قرآن پڑھ لیا ہوتا

نجیب احمد

نہ دل پہ بوجھ رہے گا نہ امتحان میں جان
درود پڑھتے رہو، جب تلک ہے جان میں جان
یہ کس کا نام لیا، روشنی اُترنے لگی
یہ کس کا ذکر چلا، پڑ گئی زبان میں جان
اُٹھانا بوجھ کوئی کم نہیں تھا قرآں کا
نہ تھی زمین میں طاقت نہ آسمان میں جان
حضورؐ، حرفِ تلطف کہ بات بن جائے
حضورؐ، بوئے تبسم کہ آئے جان میں جان
کبھی میں نعت پڑھوں اور کبھی سلام سنوں
کبھی دہن میں ہو میرے کبھی ہو کان میں جان

منیر سیفی

پھرتا ہے فلک برسوں

ڈاکٹر علی محمد خاں

میر تقی میر نے کیا خوب کہا ہے:

مت سہل ہمیں جانو، پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

یوں لگتا ہے میر نے اپنی زندگی میں ڈاکٹر عبدالغنی فاروق جیسا کوئی شخص دیکھ کر یہ شعر کہا ہے۔ ڈاکٹر عبدالغنی فاروق واقعی صحیح معنوں میں انسان تھے۔ اُن جیسا انسان چشمِ فلک نے شاید کم ہی دیکھا ہوگا۔

میرا خیال ہے کہ ہمارے بہت سے پڑھے لکھے لوگوں نے ڈاکٹر عبدالغنی فاروق کا نام تو سنا ہوگا لیکن شاید وہ ان کے بارے میں کم ہی جانتے ہوں گے کہ وہ انسانیت کے اتنے ارفع درجے پر کیسے فائز ہوئے اور میر کے اِس شعر کا اطلاق ان کی ذاتِ گرامی پر کیسے ہوتا ہے۔

مَیں ڈاکٹر عبدالغنی فاروق کو، جن کا انتقال حال ہی میں ہوا اور جنھیں مرحوم لکھتے ہوئے میرا قلم کانپتا ہے، تب سے جانتا تھا جب وہ عبدالغنی فاروق کے نام سے الطاف حسن قریشی کے ماہوار رسالے ''اردو ڈائجسٹ'' مین بڑے اچھوتے مضامین لکھتے تھے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب انگلش کے مقبولِ عام رسالے ''ریڈرز ڈائجسٹ'' کی تقلید میں ماہنامہ ''اردو ڈائجسٹ'' ۱۲۔ا ایکڑ سکیم سمن آباد لاہور سے شائع ہوتا تھا اور بشمول راقم الحروف کے لوگ نئے شمارے کے آنے کا شدت سے انتظار کرتے تھے کیوں کہ اس زمانے میں ''اردو ڈائجسٹ'' کے پائے کا کوئی اور رسالہ شائع نہیں ہوتا تھا۔

حُسنِ اتفاق سے ڈاکٹر عبدالغنی فاروق گورنمنٹ کالج آف سائنس، لاہور میں، جہاں مَیں نے کم و بیش چوبیس سال تک تدریسی فرائض انجام دیے، میرے شریکِ کار اور شریک مصنف رہے تو مجھے ان کو زیادہ قریب سے دیکھنے کا موقع ملا اور جوں جوں مَیں ان کے نزدیک ہوتا گیا توں توں زیادہ متاثر ہوا۔

مَیں چاہتا ہوں کہ مَیں ان کے بارے میں جو کچھ جانتا ہوں اس میں دوسروں کو بھی شریک کراوں تا کہ وہ بھی جان جائیں کہ آدمی کو انسان ہونا کیسے میسر آتا ہے۔

دردِ دل، پاسِ وفا، جذبۂ ایماں ہونا
آدمیت ہے یہی اور یہی انساں ہونا

ڈاکٹر عبدالغنی فاروق کی تمام تر زندگی محنت، جدوجہد اور تعلیم و آگہی کے ساتھ لگاؤ کی داستان ہے۔ وہ سیال کوٹ ایئرپورٹ کے نواحی علاقے کوٹلی نوناں سے متصل ایک چھوٹے سے گاؤں بھگت کوٹ میں، جہاں ان کے والد ایک معمولی کاشت کار تھے اور توکل کے سہارے بڑی تنگی ترشی سے اپنے اہل وعیال کو پالتے تھے، قیامِ پاکستان سے سوا پانچ سال پہلے یکم جون ۱۹۴۲ء کو پیدا ہوئے۔ کوٹلی نوناں سے پرائمری کا امتحان اور اسلامیہ ہائی سکول سمبڑیال، تحصیل ڈسکہ سے ۱۹۵۹ء میں بڑے امتیاز کے ساتھ میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ وہ بتایا کرتے تھے کہ سمبڑیال کا فاصلہ ہمارے گاؤں سے تقریباً چار کلومیٹر ہے لیکن سخت گرمی ہوتی یا چلّے کی سردی، آندھی ہوتی یا بارش مَیں نے سکول سے کبھی چھٹی نہیں کی تھی اور میں یہ فاصلہ روزانہ پیدل طے کرتا تھا۔ جب عبدالغنی نے اپنی محنت کے بل بوتے پر امتیاز کے ساتھ میٹرک پاس کر لیا تو چاہا کہ وہ روزانہ سیالکوٹ جایا کریں اور وہاں سے بی اے پاس کرلیں لیکن ان کے والد نے آگے پڑھانے سے صاف انکار کر دیا اور اپنے ساتھ کاشت کاری کے کام کاج میں منسلک کرنا چاہا تو سعادت مند بیٹے نے انھیں خوشامد درآمد سے آگے پڑھنے کے لیے قائل کرلیا۔ اس طرح وہ جناح اسلامیہ کالج سیالکوٹ میں داخل ہو گئے جہاں سے انھوں نے بڑے اچھے نمبروں میں بی اے پاس کرلیا۔ اس کے بعد ان کا ارادہ تھا کہ اگر بن سکے تو لاہور جا کر ایم اے بھی کراوں۔ اس ضمن میں انھوں نے پھر اپنے والد سے بات کی مگر اب کی بار ان کے والد اور دونوں بڑے بھائی انھیں آگے پڑھانے کے لیے کسی صورت روادار نہ تھے۔ انھوں نے اپنے والد اور بھائیوں کے سامنے یہ دلیل رکھی کہ مَیں آپ لوگوں سے ایک پیسا بھی نہیں مانگوں گا اور گاہے ماہے آپ لوگوں کا ہاتھ بھی بٹایا کروں گا کیوں کہ قوی امکان ہے کہ میں اگر تعلیم جاری رکھوں گا تو مجھے وظیفہ مل جائے گا بصورتِ دیگر مَیں وظیفے سے محروم رہوں گا۔ خیر قصہ کوتاہ ان کی دلیلیں کارگر ہوئیں اور انھوں نے اپنے والد صاحب کو ایک بار پھر رضا مند کر لیا۔

وہ بتایا کرتے تھے کہ جب انھیں والد کی طرف سے آگے پڑھنے کی اجازت مل گئی تو انھوں نے اپنے دو دوستوں سے آٹھ سو روپے کی رقم قرض لی اور لاہور کا رُخ کیا، جہاں انھوں نے پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج کی ایم اے اردو کلاس ۱۹۶۴ء-۱۹۶۶ء میں داخلہ لے لیا۔ اسی حوالے سے وہ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ مجھے اپنی کوتاہ علمی اور اپنے اناڑی پن کی وجہ سے ایم اے میں وظیفہ تو نہ مل سکا لیکن قدرت نے میری تعلیمی کفالت کا ایسا عمدہ انتظام کر دیا جو میری منزل متعین کرنے میں بھی معاون و کارگر ثابت ہوا۔

ہوا یوں کہ جب مَیں ۱۹۶۳ء- ۱۹۶۴ء میں جناح اسلامیہ کالج سیال کوٹ میں پڑھا کرتا تھا تو مَیں اپنی جبلّت کے تحت کچھ اچھوتے موضوعات پر مضامین لکھنے کی کوشش کرتا تھا اور انھیں ''اردو ڈائجسٹ'' کے مدیرِ اعلیٰ کو بذریعہ ڈاک بھیج دیتا تھا۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب اردو ڈائجسٹ کا طوطی بولتا تھا اور اسے ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا تھا اور اس رسالے میں چھپنا معنی رکھتا تھا۔ آپ اسے میری خوش بختی پر محمول کر لیجیے یا کچھ اور نام دے لیجیے مگر میں تو اسے اپنی خوش بختی ہی سمجھوں گا کہ اس زمانے میں میرے تین طبع زاد مضامین کے بعد دیگرے اردو ڈائجسٹ میں

شائع ہوئے جس پر میں بڑا خوش تھا۔ جب مَیں نے ایم اے اردو میں داخلہ لے لیا اور مجھے وظیفہ بھی نہ ملا تو میں نے سوچا کہ مجھے مالی اعانت کی سخت ضرورت ہے اور مجھے اس کا کچھ حیلہ کرنا چاہیے اور اس ضمن میں اردو ڈائجسٹ کے مدیرِ اعلیٰ جناب الطاف حسن قریشی سے ڈو بدو ملنا چاہیے۔ جب میں انھیں ملا اور اپنا تعارف کرایا تو وہ چھوٹتے ہی مجھے کہنے لگے: ''مَیں تو سمجھتا تھا کہ عبدالغنی فاروق کوئی منجھا ہوا عمر رسیدہ لکھاری ہوگا، آپ کو دیکھ کر مجھے خوش گوار حیرت ہوئی ہے۔'' اس موقع پر مجھے سر سید احمد خاں کا ایک واقعہ یاد آ گیا جب وہ بڑے جتنوں سے ماہنامہ ''تہذیب الاخلاق'' نکالا کرتے تھے اور نوجوان عبدالحلیم شرر ''تہذیب الاخلاق'' کے لیے نت نئے مضامین لکھا کرتے تھے۔ جب مولانا عبدالحلیم شرر پہلی مرتبہ سر سید احمد خاں سے ملے اور اپنا تعارف کرایا تو سر سید احمد خاں نے اسی اچنبھے کا اظہار کیا تھا جو الطاف حسن قریشی نے عبدالغنی فاروق کو دیکھ کر کیا۔ وہ کہا کرتے تھے کہ اگر اس کٹھن موقع پر الطاف حسن قریشی ان کی اعانت نہ کرتے تو میری تعلیم کے سلسلے میں ضرور کوئی رخنہ پڑ جاتا۔

کہاں مَیں اور کہاں یہ نکہتِ گل
نسیمِ سحر یہ تیری مہربانی ہے

خیر انھوں نے مجھے اسی دن اور اسی وقت ''اردو ڈائجسٹ'' کے ساتھ منسلک کر لیا اور اس طرح مجھے جز وقتی ملازمت میسر آ گئی۔

وہ مزید بتایا کرتے تھے کہ اورینٹل کالج میں، مَیں نے دو سال کیسے گزارے۔ یہ ایک عزم و ہمت کی داستان ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ مَیں نے یہ عرصہ بڑی محنت اور مشقت میں بسر کیا۔ مَیں روزانہ اورینٹل کالج سے سمن آباد جاتا اور وہاں تین گھنٹے کام کرتا تھا لیکن اس کا خوش آیند پہلو یہ رہا کہ الطاف حسن قریشی کے اثر سے میری تحریر میں بڑا نکھار آ گیا اور مَیں نے بڑی آسانی کے ساتھ سیکنڈ ڈویژن میں ایم اے اردو پاس کر لیا۔ میرے اساتذہ کرام میں ڈاکٹر سیّد عبداللہ، سیّد وقار عظیم، ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر عبادت بریلوی، ڈاکٹر سجاد باقر رضوی اور ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا شامل تھے۔ جب کہ نامور مصنّفین ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی (متوفی: ۲۵ جنوری ۲۰۲۴ء) اور عطاء الحق قاسمی (پ: یکم فروری ۱۹۴۳ء) میرے کلاس فیلو اور امجد اسلام امجد (۱۹۴۳ء-۲۰۲۰ء) مجھ سے ایک سال جونیئر تھے۔

ایک دن باتوں باتوں میں، راقم الحروف نے عطاء الحق قاسمی سے ڈاکٹر عبدالغنی فاروق کے بارے میں ان کی رائے دریافت کی تو چھوٹتے ہی کہنے لگے کہ ڈاکٹر عبدالغنی فاروق میرے کلاس فیلو تھے۔ مَیں سمجھتا ہوں کہ مَیں نے ان سے زیادہ شریف النفس شخص آج تک نہیں دیکھا۔ وہ بڑے پارسا، نیکو کار اور صوم و صلوٰۃ پر سختی سے کاربند تھے۔ ہماری کلاس میں لڑکیوں کی تعداد لڑکوں سے زیادہ تھی۔ گفت گو کرنا تو درکنار انھوں نے کبھی کسی لڑکی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا، حتیٰ کہ وہ برآمدوں میں بھی سر جھکا کر چلتے تھے کہ کہیں بھولے سے بھی کسی لڑکی پر نظر نہ پڑ جائے۔ مَیں اس کا چشم دید ہوں کہ ایک آدھ بار تو وہ کسی لڑکی سے ٹکراتے ٹکراتے بال بال بچے۔

ہم نے درج بالا سطور میں کہیں بیان کیا ہے کہ عبدالغنی فاروق نے پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج میں دو سال گزارے مگر اثنائے حصول تعلیم مین اور اس کے بعد بھی وہ تین سال تک بڑی تندہی کے ساتھ ''اردو ڈائجسٹ'' سے منسلک رہے، جہاں ہر طرف ان کی محنت و لیاقت کا چرچا ہو گیا۔ بعد ازاں انھوں نے ۱۹۶۹ء تا ۱۹۷۴ء مجیب الرحمٰن شامی کے ساتھ ہفت روزہ ''زندگی'' میں کام کیا اور مجیب الرحمٰن شامی کے ساتھ کام کا یہ سلسلہ دوستی میں ڈھل گیا جو ان کی وفات تک بدستور مصؤن و مستحکم رہا۔

عربی کی ایک ضرب المثل ہے: ''تہذیب الاطفال خیر الاشغال'' یعنی بچوں کی تہذیب و تربیت تمام پیشوں میں افضل ترین پیشہ ہے۔ اس مثل کی روشنی میں عبدالغنی فاروق کے دل کے کسی کونے کھدرے میں ایک عرصہ سے یہ آرزو تھی کہ اگر حالات یاوری کریں تو مَیں اپنی قوم کے بچوں کی تہذیب و تربیت کروں اور ان کی یہ آرزو اس وقت بر آئی جب ۱۹۷۴ء میں ان کی پنجاب پبلک سروس کمیشن سے بطور لیکچرر اردو سلیکشن ہو گئی۔ اس حوالے سے ان کی پہلی تعیناتی گورنمنٹ کالج گوجرانوالہ میں ہوئی، چناں چہ انھوں نے ہفت روزہ ''زندگی'' کو الوداع کہا اور متذکرہ ادارے میں پڑھانے لگے، جہاں وہ ۱۹۸۰ء تک پڑھاتے رہے۔ اس کے بعد جب ان کی ٹرانسفر لاہور میں نسبت روڈ پر گورنمنٹ دیال سنگھ کالج میں ہو گئی تو وہاں ڈیرہ جما لیا اور ۱۹۹۳ء تک اپنے فرائض ایمان داری کے ساتھ انجام دیتے رہے۔

گورنمنٹ دیال سنگھ کالج کے عرصہ ملازمت کے دوران میں انھوں نے ایک اور بڑا کام یہ انجام دیا کہ پنجاب یونیوٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کر لی۔ ان کے مقالے کا عنوان تھا ''ماہر القادری۔ حیات اور ادبی خدمات'' حسنِ اتفاق ملاحظہ کیجیے کہ پنجاب یونیورسٹی نے ان کے مقالے کا نگران ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کو مقرر کیا جو ایم اے اردو میں ان کے کلاس فیلو اور بعد ازاں ملتان روڈ لاہور پر واقع منصورہ میں ان کے ہمسائے تھے۔ بہر کیف وہ جو کہتے ہیں کہ ''دو دل یک شود بشکند کوہ را'' انھوں نے ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کی رہنمائی میں مقالہ بعنوان ''ماہر القادری۔ حیات اور ادبی خدمات'' لکھا اور لکھنے کا حق ادا کر دیا اور انھیں پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے ۱۹۹۰ء میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری مل گئی۔ اب وہ ڈاکٹر عبدالغنی فاروق تھے اور ان کا پڑھنے لکھنے کا شوق دو چند بلکہ سہ چند ہو گیا تھا۔ انھوں نے گورنمنٹ کالج گوجرانوالہ مین پانچ سال تک پڑھانے کے بعد ۱۹۸۰ء تا ۱۹۹۳ء یعنی تیرہ چودہ سال تک نسبت روڈ پر گورنمنٹ دیال سنگھ کالج میں پڑھایا۔ دیال سنگھ کالج انھیں اپنے گھر منصورہ لاہور سے کافی دُور پڑتا تھا اور آنے جانے میں کافی وقت صرف ہوتا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ اگر بن پڑے تو کسی طرح ان کی ٹرانسفر وحدت روڈ پر گورنمنٹ کالج آف سائنس میں ہو جائے جو ان کے

گھر سے کافی قریب تھا۔

کہتے ہیں کہ قدرت کی طرف سے ہر کام کے ظہور پذیر ہونے کا ایک وقتِ معیّن ہے۔ انھی دنوں سائنس کالج وحدت روڈ کے شعبہ اردو میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جو ڈاکٹر عبدالغنی فاروق کے سائنس کالج وحدت روڈ میں ٹرانسفر ہونے کا باعث بنا۔ یہ داستان بڑی دل چسپ مگر اس لیے قابلِ سماعت ہے کہ درس وتدریس کے مقدس پیشے سے وابستہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ ان کی صفوں میں، ہر چند ان کی تعداد قلیل ہے، کچھ ایسے لوگ ضرور موجود ہیں جو اس کمیونٹی کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکا ہیں۔

ہوا یوں کہ اُن دنوں سائنس کالج کے شعبہ اردو میں نیشنلائزڈ کیڈر کے ایکفل پروفیسر شامل تھے، جن کا اسمِ گرامی طارق محمود تھا اور جو ہمیشہ نکتائی وغیرہ سے لیس رہتے اور اپنی تراش خراش پر بڑا زور دیتے۔ وہ بزعمِ خود اپنے آپ کو بڑا خوش لباس گردانتے تھے مگر انھیں پڑھنے پڑھانے سے کوئی خاص شغف نہ تھا، شاید ان میں یہ وصف بالکل ہی نہ تھا۔ انھوں نے جب اپنی کلاسوں کے ایک عرصہ تک پرچے مارک نہ کیے تو صدر شعبہ شماریات پروفیسر انوار پرداز نے، جو ان دنوں کالج میں کنٹرولر امتحانات کے فرائض بھی انجام دیتے تھے، مجھ سے طارق محمود کے پرچے جمع نہ کرانے کی شکایت کی تو میں نے انھیں اس بارے میں دو تین بار یاددہانی کرائی۔ بالآخر انھوں نے پرچے مارک کر دیے مگر اس طرح کہ کچھ طلبہ کو تو فیل کر دیا اور بیشتر طلبہ کو سو میں سے تیس، اکتیس اور بتیس نمبر دیے۔ کلاسوں میں کھلبلی مچ گئی۔ مَیں نے پروفیسر صاحب سے گزارش کی کہ تین نمبروں تک کی کمی سے کسی بچے کو فیل نہ کریں اور براہِ کرم ایسے تمام پرچوں پر نظرِ ثانی کریں۔ پروفیسر صاحب نے میری بات سنتے ہی لڑکوں کو پنجابی میں کوسنا شروع کر دیا۔ ان کے جملوں کا مفہوم یہ تھا جب بچے کچھ نہیں کریں گے اور صحیح نہیں لکھیں گے تو ان کے ساتھ ایسا ہی سلوک ہوگا اور وہ کسی بھی رعایت کے ہرگز مستحق نہیں ہیں۔

ان میں سے ایک پرچہ کسی پولیس آفیسر کے ایسے لڑکے کا تھا جو نہ صرف خوش خط تھا بلکہ ہمیشہ اپنی کلاس میں اوّل آتا تھا۔ طالب علم مذکور کے تیس نمبر تھے۔ اس لڑکے نے اپنی جوابی کاپی دیکھنا چاہی تو پروفیسر صاحب نے کاپی دکھانے سے صریحاً انکار کر دیا۔ وہ لڑکا اپنے والد کو لے کر کالج آ گیا اور وہ لوگ پرنسپل صاحب ڈاکٹر عبدالقیوم خان لودھی سے ملے۔ پرنسپل صاحب اُن سے بڑی عزت وتکریم سے پیش آئے اور مجھے بحیثیت صدر شعبہ اردو طلب کیا۔ میں نے کنٹرولر آفس میں جوابی کاپیاں چیک کیں تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ان میں سے ایک بھی پرچہ مارک نہ ہوا تھا اور سب کے سب پرچوں پر صرف ایک دائرے میں حاصل کردہ کل نمبر ہی لگے تھے۔ کنٹرولر امتحانات اور مَیں نے یہ تماشا دیکھ کر اپنا سر پیٹ لیا اور ساری صورتِ حال پرنسپل صاحب پر واضح کی تو وہ بھی بھونچکا رہ گئے۔ خیر قصہ کوتاہ یہ کہ پرنسپل صاحب نے پولیس آفیسر کو تو کچھ وعدے وعید کر کے رخصت کیا اور مَیں جب طارق محمود صاحب کو ملا اور ان سے پرچوں کے بارے میں استفسار کیا تو وہ بڑی ڈھٹائی سے کہنے لگے کہ آپ لوگوں نے جلدی مچا رکھی تھی، جلدی میں تو یہی کچھ ہو سکتا تھا۔ مَیں نے کہا: آفرین ہے آپ پر۔ اس پر کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے چلے گئے مگر انھوں نے عافیت اسی میں سمجھی کہ یہاں ان کی مزید دال نہیں گلنے والی اور ہفتے عشرے کے اندر ہی ڈاکٹر عبدالغنی فاروق سے میوچل ٹرانسفر کرالی۔ جب وہ دیال سنگھ کالج چلے گئے تو انھوں نے مجھے پیغام بھیجا کہ بڑھ بڑھ کے باتیں کرتے تھے مَیں دیال سنگھ کالج میں صدرِ شعبہ لگ گیا ہوں، جس پر مَیں کچھ بھی تبصرہ نہ کر سکا۔

خیر ڈاکٹر عبدالغنی فاروق، جنھیں مَیں پہلے سے جانتا تھا، وحدت روڈ سائنس کالج میں آ گئے تو ہم سب لوگ ان کی علمیت اور شرافت ونجابت کی بنا پر ان سے بے حد متاثر ہوئے اور مَیں نے تو ان سے بہت کچھ سیکھا۔ مجھے تسلیم ہے کہ جب بھی مجھے قرآن وحدیث کے حوالے سے کوئی راہ سجھائی نہیں دیتی تھی تو مَیں کتابیں کھنگالنے کے بجائے ڈاکٹر عبدالغنی فاروق سے پوچھ لیتا تھا اور وہ مجھے ہمیشہ ہی تفصیلی اور تشفی آمیز جواب سے نوازتے تھے۔

انھی دنوں کی بات ہے کہ پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ کی ایک کتاب میں مولانا شبلی نعمانی کے ایک جملے کو من وعن لکھ دینے کی پاداش میں حکومت کے اربابِ اختیار نے ہم تینوں مؤلفین: ڈاکٹر تحسین فراقی، پروفیسر جعفر بلوچ (مرحوم) اور راقم الحروف سے جواب طلب کیا۔ جماعتِ اسلامی کی ایک سربرآوردہ خاتون نے اس حوالے سے ایک پریس کانفرنس بھی کر ڈالی اور معاملے نے طول کھینچا تو اس موقع پر عطاء الحق قاسمی اور منو بھائی نے ہمارے حق بجانب ہونے میں کالم لکھے اور اس معاملے کو سلجھانے میں ڈاکٹر عبدالغنی فاروق بھی پیش پیش تھے۔ پھر یہ ہوا کہ جب مجھے بارھویں جماعت کی اردو لازمی کی کتاب ''سرمایۂ اردو'' کو تالیف کرنے کا موقع ملا تو مَیں نے ڈاکٹر عبدالغنی فاروق کو بھی اپنے ساتھ شریک کر لیا جنھوں نے حقِ شراکت خوب ادا کیا اور ان کے ساتھ میری دوستی اور بڑھ گئی۔

ڈاکٹر عبدالغنی فاروق ایک کثیر التصانیف شخص تھے۔ ان کی تصنیف وتالیف کا جو سلسلہ ۱۹۶۳ء میں شروع ہوا تھا، اس وقت تک جاری رہا جب تک فرشتۂ اجل نے اُن کے ہاتھ سے قلم نہیں چھین لیا۔ اُن کی اُن کتابوں کی کل تعداد، جو زیورِ طباعت سے آراستہ و پیراستہ ہوئیں، سترہ ہے۔ ان میں سے تین کتابوں کو ایسی مقبولیت حاصل ہوئی کہ باید وشاید۔ ان میں سے ایک کتاب کا نام ہے: ''ہم کیوں مسلمان ہوئے؟'' اس کتاب میں نوے نومسلموں کے حالات اور ایمان افروز واقعات درج ہیں۔ اس کتاب کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ حال ہی میں اس کا اکیسواں ایڈیشن شائع ہوا ہے۔ ایک دوسری تصنیف کا نام ہے: ''ہمیں خدا کیسے ملا!'' اس کتاب میں ایسی اِکاسی نومسلم خواتین کے حالات درج ہیں جنھوں نے کفر والحاد سے بیزار ہو کر اسلام قبول کیا

CamScanner

اوراس کے بعد ان کا شمار راسخ العقیدہ مسلم خواتین میں ہونے لگا۔ اس کتاب کے بھی اب تک دس بارہ یا شاید اس سے بھی زیادہ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ اُن کی اہم تالیفات میں ''کلیاتِ ماہر القادری'' مطبوعہ ۱۹۹۴ء شامل ہیں جسے اُنھوں نے بڑی عرق ریزی سے مدوّن کیا ہے اور اس کے بھی کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ علاوہ ازیں ان کی ایک تصنیف کا نام: ''مکافاتِ عمل'' ہے۔ اس کتاب کے حوالے سے ایک پُرلطف واقعہ بھی سن لیجیے۔ ہوا یوں کہ جب یہ کتاب پندرہ سولہ سال پہلے پہلی بار چھپی اور ڈاکٹر عبدالغنی فاروق ایک نسخہ عنایت کرنے کے لیے میرے گھر ''کنجِ عافیت'' پر تشریف لائے تو اتفاق سے میرے بڑے بھائی جمال محمد خاں (مرحوم)، جو ایک وسیع المطالعہ شخص تھے، گاؤں سے آئے ہوئے تھے۔ انھوں نے کتاب دیکھی تو رہ نہ سکے اور وہ کتاب لے کر گاؤں چلے گئے۔ مَیں نے بہ تحقیق سنا ہے کہ وہاں وہ روزانہ اپنی حویلی میں لوگوں کے جھرمٹ میں بیٹھ جاتے اور اس کتاب میں سے تین چار واقعات لوگوں کو سناتے تھے اور لوگ عبرت پکڑتے تھے۔ انھیں ''مکافاتِ عمل'' اتنی عزیز تھی کہ انھوں نے مجھے صاف کہہ دیا کہ مَیں یہ کتاب آپ کو ہرگز نہ دوں گا۔ آپ ڈاکٹر عبدالغنی فاروق سے اس کتاب کا دوسرا نسخہ لے لیں۔

ڈاکٹر عبدالغنی فاروق، جنھیں ''مرحوم'' لکھنا میری غلطی ہے کیوں کہ ایک مؤقر اور مؤثر مصنف اپنے زورِ قلم سے ہمیشہ زندہ رہتا ہے، بڑے اوصاف کے مالک تھے۔ ان کا ایک نمایاں وصف تحقیق و تدقیق تھا۔ جب تک وہ کسی ایسی بات کا، جو ان کے دل میں بیٹھ جاتی تھی، کھوج نہ لگا لیتے تھے، انھیں چین نہ آتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہر وقت بنیادی مصادر و منابع کو دریافت کرنے میں لگے رہتے تھے اور ہر کتاب کا مطالعہ گہرائی اور باریک بینی سے کرتے تھے۔ علاوہ ازیں وہ قلم برداشتہ لکھنے پر قادر تھے۔ لکھنے کے معاملہ میں مَیں نے ان کے پائے کے بہت کم لوگ دیکھے ہیں۔ مَیں نے انھیں اور ان کے ہم سائے ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کو اپنی خاکوں پر مبنی یکے بعد دیگرے دو کتابیں، ''اب انھیں ڈھونڈ'' اور ''چراغِ رخِ زیبا'' پیش کیں تو انھوں نے کتابوں کو حرفاً حرفاً اور لفظاً لفظاً پڑھا اور کہا کہ یہ میری بہت اچھی کاوش ہے اور دونوں کتابوں میں پروف کی چند غلطیوں کی بھی نشاندہی کی اور مجھے تاکید کی کہ آیندہ ایڈیشن میں ان اغلاط کی تصحیح کر لینا۔ میں یہ کہتا ہوں کہ مذکورہ دونوں کتابیں اگر اغلاط سے پاک ہیں تو یہ ڈاکٹر عبدالغنی فاروق کا کمال ہے۔

ڈاکٹر عبدالغنی فاروق نے طبقۂ نسواں کی اصلاح کے لیے بھی بہت کچھ لکھا۔ اس ضمن میں ان کی جب بھی کوئی نئی کتاب چھپ کر آتی تھی تو وہ اسے میری شریکِ حیات کو، جن کو انھوں نے اپنی منھ بولی بہن بنایا ہوا تھا، دینے کے لیے ''کنجِ عافیت'' پر ضرور تشریف لاتے تھے اور انھیں ہر بار تاکید کرتے تھے کہ اس کتاب کے متن کو اپنے حلقۂ اثر کی دوسری مستورات تک بھی پھیلائیں۔

اسی دوران میں میری بیٹی ڈاکٹر فرح علی کا عزیزم فرحان منیر کے ساتھ نکاح مسنون پڑھانے کا مرحلہ درپیش ہوا تو میں اپنے ہمدمِ دیرینہ مولانا عبدالجبار شاکر سے، جو اُن دنوں اسلام آباد میں اسلامک یونیورسٹی کے ڈائریکٹر اور فیصل مسجد اسلام آباد میں جمعہ کا خطبہ دیا اور امامت کرایا کرتے تھے اور جہاں کچھ عرب ممالک کے سفرا بھی ان کی اقتدا میں نماز پڑھتے تھے، گزارش کی کہ بچی کا نکاح وہ پڑھائیں مگر اُن دنوں کچھ ایسے پیچ پڑے کہ وہ تاریخ مقررہ پر بوجوہ تشریف نہ لا سکے تو انھوں نے یہ ذمہ داری ڈاکٹر عبدالغنی فاروق کو سونپ دی اور یہ فریضہ انھوں نے ادا کیا۔

ڈاکٹر عبدالغنی فاروق نے وقتِ نکاح اپنی مختصری تقریر میں فصاحت و بلاغت کے جو جوہر دکھائے وہ کسی نے شاید کم ہی دیکھے یا سنے ہوں گے اور اپنی جیب سے بچی کو گراں قدر سلامی بھی دی۔ کہنے لگے کہ اس موقع پر علامہ اقبال کی بات کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ انھوں نے بھی اپنی زندگی میں فقط ایک نکاح پڑھایا تھا اور وہ فیض احمد فیض کی بیگم ایلس فیض کی بڑی بہن بلقیس تاثیر کا اپنے دوست اور اسلامیہ کالج ریلوے روڈ، لاہور کے پرنسپل ایم ڈی تاثیر کے ساتھ اور مَیں نے بھی اپنی زندگی میں فقط یہی ایک نکاح پڑھایا ہے۔

یہ شاید ڈاکٹر عبدالغنی فاروق کی دعاؤں کا اثر تھا یا کیا کہ ڈاکٹر فرح علی اپنے شوہر نامدار عزیزم فرحان منیر کے ساتھ سڈنی (آسٹریلیا) میں اپنی دو بیٹیوں، رجا فرحان اور ہبہ فرحان کے ساتھ انتہائی مطمئن اور خوشگوار عائلی زندگی بسر کر رہی ہیں۔

اس موقع پر مجھے ڈاکٹر عبدالغنی فاروق کی ایک اور ایسی بات بھی یاد آ رہی ہے جسے ضبطِ تحریر میں ضرور آنا چاہیے۔ وہ یہ کہ مرحوم نے سائنس کالج وحدت روڈ سے اپنی ریٹائرمنٹ کی تاریخ (۳۱ مئی ۲۰۰۲ء) سے ایک سال پہلے ہی اس لیے ریٹائرمنٹ لے لی کہ وہ اپنا زیادہ تر وقت تصنیف و تالیف میں بسر کریں گے اور ساتھ ہی انھوں نے رائے ونڈ روڈ پر واقع دی یونیورسٹی آف لاہور میں ایم بی بی ایس کے طالب علموں کو ہفتے میں دو دن لازمی مضمون اسلامک سٹڈیز پڑھانا شروع کیا اور اسی یونیورسٹی کی مسجد میں وہ جمعہ کی نماز کا خطبہ بھی دیتے اور نماز پڑھانے لگے۔ مَیں نے بھی ایک جمعہ کی نماز ان کی اقتدا میں ادا کی تھی۔ ایک دن مجھے کہنے لگے کہ مَیں نے طے کیا ہے کہ مَیں آیندہ طالب علموں کو اردو غزلوں کی ڈھکوسلا تشریح کبھی نہیں کراؤں گا اور اپنا سبجیکٹ بدل لوں گا اور یونیورسٹی کے طالب علموں کو، جو میری باتوں کو بخوبی سمجھتے ہیں، اسلامک سٹڈیز کی بنیادی باتوں سے روشناس کراؤں گا اور انھیں نماز روزے کی طرف لاؤں گا۔

ڈاکٹر عبدالغنی فاروق کو دنیا سے رخصت ہوئے ایک ماہ کا عرصہ گزر گیا ہے (تاریخ وفات: ۲۰/ اپریل ۲۰۲۴ء) مگر ان کی باتیں ایسی ہیں جنھیں ہم تادیر بھلا نہ پائیں گے کیوں کہ بقول حافظ شیرازی:

ہرگز نہ میرد آں کہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است بر جریدۂ عالَم دوامِ ما

جسٹس (ر) میاں نذیر اختر کی کتاب ''فکرِ فراواں'' پر اظہارِ خیال

نسیم سحر، سرفراز شاہد، ڈاکٹر جعفر حسن مبارک

قبل ازیں مجھے جسٹس (ر) میاں نذیر اختر کے مجموعۂ حمد ونعت ''عودِنگر'' اور مجموعۂ غزلیات ''شمعِ خیال'' پر اظہارِ خیال کا موقع ملا۔ اب ان کا ایک اور مجموعۂ کلام ''فکرِ فراواں'' کے عنوان سے میرے سامنے ہے۔ آغاز میں ہی انہوں نے قطعات کی صورت میں اپنی آبائی حویلی کی کچھ یادیں جمع کی ہیں جو اپنے رنگ میں خوب ہیں۔ زیادہ تر کلام سیاسی، طنزیہ اور مزاحیہ منظومات پر مشتمل ہے۔ انہوں نے اپنی طویل نظم ''آمرنامہ'' میں کھل کر فوجی آمروں پر لکھا ہے اور برملا کہا ہے کہ آئینِ پاکستان کو ختم، معلق یا معطل کرنا سنگین جرم ہے جس کی سزا موت یا عمر قید ہے۔ انہوں نے جہاں فوج کی بطور ادارہ اہمیت کو ایک عمدہ نظم ''پاک فوج کی وردی'' لکھ کر اس کی جرأت، عظمت اور شان کو بیان کیا ہے، وہیں بعض فوجی آمروں کے کردار کو ہدفِ تنقید بنایا ہے۔ یہ مثبت تنقید نیک نیتی سے شائستہ اظہارِ رائے، یعنی Fair Coment کی تعریف میں آتی ہے جو بطور ادارہ فوج کے بارے میں نہیں ہے۔ حُسنِ نیت کی تصویب نظم ''پاک فوج کی وردی'' سے ہوتی ہے۔ اسی لیے میاں نذیر اختر نے ان اشعار کو درست سیاق وسباق میں پڑھنے کی ضرورت پر بجا طور پر زور دیا ہے۔

اس کتاب میں شامل طنزیہ ومزاحیہ کلام ایسا نہیں جسے محض تفریحِ طبع کی خاطر پڑھا جائے بلکہ میرے خیال میں یہ کلام بھی کتاب میں شامل دیگر عنوانات کے کلام کی مانند اہم اور قابلِ توجہ ہے۔ یوں جانیے کہ قارئین کو کڑوی گولی کھلانے کے لیے اسے شوگر کوٹڈ کیا گیا ہے۔ طویل نظم ''آمرنامہ'' کے چند اشعار پیشِ خدمت ہیں:

کالج کے زمانے سے ہی آزاد منش ہے
کہتے ہیں کہ مدت سے قدح خوار ہے آمر
اعدا ہیں بہت ختمِ نبوت کے وطن میں
اور ان کے مناصب کا نگہدار ہے آمر
ہندو سے بھی اُلفت کی بڑھانے لگا پینگیں
بھارت سے بھی قربت کا طلبگار ہے آمر

ایک مزاحیہ نظم کے چند اشعار مندرجہ ذیل ہیں:

چلاتے ہیں ''جسٹس'' جہاں انصاف کی خاطر
گنتی میں کہاں آتے ہیں عمران وغیرہ
سرحد کی حفاظت کے لیے چین سے کہہ دو
حافظ ہوں معیشت کے تو جاپان وغیرہ
ٹی وی کی ہدایات پہ اولاد ہے چلتی
ماں باپ کا سنتی نہیں فرمان وغیرہ

اسی طرح ''لوٹا نامہ'' بھی مزاحیہ انداز میں سیاسی قلابازیوں پر طنزیہ اشعار پر مشتمل ہے جبکہ ''سویٹ ڈش'' کے عنوان سے بھی مزاحیہ قطعات شاملِ کتاب ہیں۔ ان میں سے دو قطعات بطور سویٹ ڈش نذرِ قارئین ہیں:

میٹھے لہجے میں جو کلام کرے
ایسے بندے کو دل سلام کرے
جو بھی حلوے کا اہتمام کرے
دل بھی پھر اس کا احترام کرے

....

وہ جو میرے قریب ہو جائے
حال میرا عجیب ہو جائے
ایسی قسمت کہاں کہ روزانہ
مجھ کو حلوہ نصیب ہو جائے

جسٹس میاں نذیر اختر کی سیاسی منظومات میں ملک وقوم کا درد جھلکتا ہے۔ مزاحیہ کلام میں بھی سنجیدہ فکر اور پیغامات موجود ہیں۔ اس لیے اس مختصر مجموعۂ کلام پر مبنی کتاب کا نام ''فکرِ فراواں'' بھی بہت جچتا اور سجتا ہے۔ میں ان کی صحت اور تندرستی کے لیے دعا گو ہوں۔

ع اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ

نسیمِ سحر

خیابانِ طنز ومزاح

معزز قارئین! جسٹس (ر) میاں نذیر اختر کے گلستانِ سخن کی سیر کرتے ہوئے آپ کو اچانک ایک ایسا گوشہ نظر آئے گا جسے بجا طور پر خیابانِ طنز ومزاح کہا جا سکتا ہے۔ اُن کی حمدیہ، نعتیہ اور سنجیدہ شاعری کا ایک منفرد انداز ہے لیکن فکاہیہ شاعری کا رنگ بھی جداگانہ ہے جو فطرت نے انہیں روشنیٔ طبع کے طور پر عطا کیا ہے۔

میری دانست میں ایک اچھا مزاحیہ شعر وہ ہے جس میں حُسنِ خیال بھی ہو، حُسنِ بیان بھی ہو اور حُسنِ تبسم بھی۔ یعنی ایسا شعر جو قاری کے لبوں پر مُسکان لے آئے اور ذہن میں فکر کا طوفان بھی لے آئے۔ ہمارے شاعر کا شعر آپ کو فلک شگاف قہقہہ لگانے پر مجبور نہیں کرتا، البتہ تبسم زیرِ لب کی ایک کیفیت میں تسلسل سے بتلا رکھتا ہے اور یہی اعلیٰ مزاحیہ شاعری کی پہچان ہے۔ مجموعۂ کلام ''فکرِ فرواں'' کے خیابانِ طنز ومزاح میں ایسے اشعار جا بجا ملتے ہیں جنہیں پڑھ کر آپ خود کو ''مسکرواتا'' ہوا محسوس کرتے ہیں اور یہ کوئی معمولی بات نہیں۔

صاحبو! طنز ومزاح کے حوالے سے جسٹس (ر) میاں نذیر اختر کے موضوعات بھی عمومی اور عوامی ہیں۔

CamScanner

مثلاً ان کا سب سے دلچسپ اور لذیذ موضوع ''سویٹ ڈش'' (بحوالہ حلوہ) ہے۔ جس کے متعلق انہوں نے کئی اشعار لکھ ڈالے ہیں۔ دو اشعار ملاحظہ ہوں:

حلوے کی محبت میں عجب حال ہے یارو
دِن رات مجھے اس کے ہی سپنے نظر آئیں
جس گھر سے بھی حلوے کی مہک آتی ہے اخترؔ
اُس گھر کے مکیں مجھ کو تو اپنے نظر آئیں

حلوے کے علاوہ آمروں، لیڈروں، رشوت خوروں اور سرکاری اہلکاروں کی بھی خوب خبر لی ہے۔ مگر ان منظومات میں مثبت پیغام دیا ہے۔ سیاست دانوں کے حوالے سے ان کا یہ قطعہ خوب ہے:

ہمیں، جھگڑوں کی عادت ہو گئی ہے
بہت دھرنوں کی عادت ہو گئی ہے
نچایا قوم کو یوں لیڈروں نے
کہ اب بھنگڑوں کی عادت ہو گئی ہے

نذیر اختر صاحب نے لوٹوں کے بارے میں بھرپور شاعری کی ہے۔ ہماری سیاست ''لوٹا کریسی'' سے بھری ہوئی ہے۔ چنانچہ ہمارے شاعر نے لوٹوں کے حوالے سے عمدہ طنز و مزاح کا مظاہرہ کیا ہے:۔

چہرے تو پُرانے ہیں مگر رُوپ نیا ہے
۔بہروپ بدلنے میں تو فنکار ہیں لوٹے
ہر دور کے حاکم کو غلط راہ پہ ڈالیں
جی چاہے کہ چُن دوں کسی دیوار میں لوٹے

معزز قارئین! قدیم دور میں شاعری میں سہرا خوانی کو بہت اہمیت حاصل تھی۔ مگر رفتہ رفتہ یہ روایت دم توڑتی گئی۔ اس مجموعۂ کلام میں ہمارے شاعر نے اس روایت کو زندہ کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے اور تین عدد جدید سہرے ادبی انداز میں پیش کیے ہیں۔ یہ کاوش قابلِ ستائش ہے۔ اُمید ہے ان کی یہ کاوش سہرا نویسی کی روایت کو آگے بڑھانے میں ممد و مددگار ثابت ہوگی۔ سہرے کا ایک دعائیہ شعر ملاحظہ ہو:

مری دعا ہے کہ دولہا دلہن پھلیں پھولیں
خوشی کا جھولا ہمیشہ حیات میں جھولیں
ملیں گی تب انہیں لاریب دائمی خوشیاں
خدا رسولؐ کے احکام نہ کبھی بھولیں

معزز قارئین! مجموعی طور پر دیکھا جائے تو جسٹس (ر) میاں نذیر اختر کی فکاہیہ شاعری شگفتگی اور شائستگی کا ایک خوبصورت امتزاج ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اسے حکمت کا تڑکا بھی لگا ہوا ہے۔ مزاحیہ شعر اگر حکمت سے خالی ہو تو وہ لذیذ تو ہو سکتا ہے، مفید نہیں ہو سکتا۔ میں شاعر کو اس مجموعۂ کلام کی اشاعت پر دل کی گہرائیوں سے مبارک پیش کرتا ہوں اور اپنی بات اس شعر پر تمام کرتا ہوں کہ

کہتے ہیں لوگ جس کو ظریفانہ شاعری
ہوتی ہے اصل میں وہ حکیمانہ شاعری

سرفراز شاہد

جناب جسٹس (ر) میاں نذیر اختر کا مجموعۂ منظومات

قانون اور شعر میں ایک باہمی ربط ہوتا ہے۔ دونوں میں نکتہ وری، سخن وری اور معروضی مقصدیت موجود ہوتی ہے۔ ادب اور قانون کا اندازِ تفکر و تدبر بڑی حد تک مماثل ہوتا ہے۔ دونوں میں حقیقت اور صداقت کی تلاش کا جذبہ موجزن ہوتا ہے۔ ان کو پانے کے بعد دونوں میں واضح طور پر اظہار و بیان اور ابلاغ کی کاوش کی جاتی ہے۔ عدالتوں میں وکلا کی بحث اور عدلیہ کے فیصلوں میں خاص نکات کا بیان اور تائیدی مواد کا حوالہ ہوتا ہے۔ شاعری میں بھی جذباتی اور فکری نکات کو بیان کیا جاتا ہے۔ دونوں صورتوں میں ایک فرد اپنی بہترین علمی، فکری، ذہنی اور جذباتی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر ادراکِ حق کرتا ہے اور پھر اسے اپنی حدود میں رہ کر بیان کرتا ہے۔

جسٹس (ر) میاں نذیر اختر نظم و نثر میں ایک پُروقار ادبی روایت کے سربرآوردہ علمبردار کے طور پر اپنا تعارف پیش کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان کے تخلیقی اظہار کی وسعت اور جامعیت انتہائی حدوں کو چھوتی نظر آتی ہے۔ ان کے شعری واجبات میں موضوعاتی اور فکری تنوع کے ساتھ اثر انگیزی موجود ہے۔ موضوعاتی تنوع کے اعتبار سے ان کی منظومات کا دائرۂ سخن، عمومی شعرا کی بہ نسبت زیادہ وسیع اور کشادہ ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ان کی سوچ کا محیط اور مرکز ان کی اپنی ذات نہیں بلکہ وہ اپنے فکری، جذباتی اور جمالیاتی ردِ عمل میں سماج کی اجتماعی صورتِ حال کو مدِ نظر رکھتے ہیں۔ وہ اپنے اردگرد رونما ہونے والی سیاسی، معاشی، علمی، ثقافتی، غرض ہر نوع کی تبدیلیوں کے اثرات کے معاشرتی اطلاقات اور اثرات کا تجزیہ کر کے نتائج اخذ کرتے ہیں اور پھر ان کو اپنے تخلیقی عمل کا حصہ بنا کر سماج تک پہنچاتے ہیں۔

ایک نظم نگار کے طور پر ان کا شعری رویہ، دو واضح حصوں میں منقسم ہوتا نظر آتا ہے۔ ان کے تخلیقی وفور کے ایک حصے کا تعلق سنجیدہ موضوعات سے ہے جبکہ دوسرا حصہ طنز و مزاح کا مظہر ہے۔ سنجیدہ شاعری کے تناظر میں دیکھا جائے تو ان کے کلام میں ''مقصدیت'' واضح نظر آتی ہے۔ وہ اپنے ادبی نظریے کے حوالے سے ادب برائے ادب کے قائل نہیں بلکہ ادب بھی ان کے نزدیک اسی مقصدیت کا حامل ہے جس کے تحت آئین، قانون، ضابطے، روایات اور اخلاقی اقدار ظہور پذیر ہوتی ہیں۔ شعر و ادب ان کے نزدیک ذات کی تطہیر اور سماج کی اصلاح کا ذریعہ ہے۔ یہ شعری رویہ ہمیں مولانا

CamScanner

الطاف حسین حالی، مولانا ظفر علی خان اور شورش کاشمیری جیسے مصلحین صاحبانِ اسلوب شعرا کی یاد دلاتا ہے۔ میاں صاحب کو فرد کی آزادی، آئین اور قانون کی سربلندی، سچائی، اخلاص اور سماجی انصاف جیسی قدریں از حد عزیز معلوم ہوتی ہیں۔ انہیں مغربی جمہوری اقدار کی بہ نسبت اسلامی شورائی نظام، ارفع و اعلیٰ نظر آتا ہے۔ وہ اپنی نظم ''دورِ احتساب'' میں کہتے ہیں:

اسلام کے نظام کا کر دیجیے نفاذ
کوئی تو کام کیجیے آخر ثواب کا
''شوریٰ'' نظامِ رحمتِ پروردگار ہے
مکر و فریب نام ہے اب انتخاب کا

سیاسی حوالہ سے ان کا دائرۂ فکر قومی جبکہ مذہبی حوالہ سے ملّی ہے۔ جب وہ عصرِ حاضر پر نگاہ ڈالتے ہیں تو ملّتِ اسلامیہ کے جزوِ بدن کے طور پر دینِ اسلام کو پیش آمدہ مشکلات کا ادراک کرتے ہوئے طنزیہ انداز میں کہتے ہیں:

یہ باطن پست ہیں ظاہر میں جو ذی شان لگتے ہیں
یہ خادم غرب کے، مشرق میں جو سلطان لگتے ہیں
نہیں ہے فکر ان کو کوئی بھی دینی مقاصد کی
حکومت کی ہی گاڑی کے وہ گاڑی بان لگتے ہیں

طنز و مزاح کے تناظر میں دیکھا جائے تو ان کی منظومات اکبر الٰہ آبادی کی شعری روایت سے انسلاک کا اعلامیہ بنتی دکھائی دیتی ہیں۔

زمانے میں حیا باقی نہیں ہے
شرافت کی ادا باقی نہیں ہے
ہوسناکی رچی ہر دل میں اتنی
نگاہوں میں صفا باقی نہیں ہے

....

سکوں بھی اب رہا باقی نہیں ہے
کوئی مقصد بھلا باقی نہیں ہے
دیے بیٹھے ہیں ہر سُو لوگ دھرنے
گزرنے کی جگہ باقی نہیں ہے

یوں محسوس ہوتا ہے کہ اگر اکبر الٰہ آبادی آج کا زمانہ پاتے تو بالکل اسی طور پر ہی سخن طراز ہوتے۔ ان کا لب و لہجہ قریب قریب ایسا ہی ہوتا۔ ان کی مزاحیہ شاعری کے لطیف مفہوم سے اثر پذیر ہو کر قاری متبسم ہوتا ہے، کھلکھلا کر نہیں ہنستا۔ یہ خوشبو سے مماثل خوش طبعی اور شگفتگی مزاحیہ کلام کا حُسن ہے۔

ان کی نظموں میں خود غرضی، مالی لُوٹ کھسوٹ، منافقت، لادینیت، بدعنوانی اور جھوٹ کے خلاف صدائے احتجاج سنائی دیتی ہے۔

ان کی زیادہ تر نظمیں واقعاتی ردِ عمل کی نظمیں ہیں۔ مثلاً ''جامعہ حفصہ اسلام آباد کے سانحۂ عظیم پر'' ۔ ''پشاور کے معصوم شہیدوں کے نام'' ۔ ''ملالہ'' ۔ ''نیا قانون (تحفظِ نسواں ایکٹ 2006ء کے نفاذ کے بعد)'' وغیرہ۔ ایک اور نظم بعنوان ''نیا قانون'' قانون دانی اور شعر خوانی کے باہمی ربطِ تخلیق کی وضاحت کرتی ہوئی ایک عمدہ نظم ہے جبکہ ''دورِ احتساب'' ۔ ''حاکم'' ۔ آمریت کے حوالہ سے سات حصوں پر مشتمل نظم، جس میں ''آمر'' کا لفظ بطور ردیف استعمال کیا گیا ہے، ملکِ عزیز میں آمریت اور مقتدر قوتوں کے جابرانہ کردار کو للکارتی ہوئی فکر انگیز نظمیں ہیں۔ میاں صاحب کی نظموں کا تخلیقی وصف یا نمایاں عنصر ان کی انسان دوستی، دردمندی اور قومی و ملّی درد ہے۔ ان کی دیگر نظموں میں نظم ''حویلی'' نے مجھے بہت متاثر کیا، جبکہ انہوں نے اپنے بیٹے ''میاں کاظم نذیر'' اور بھتیجے ''میاں زبیر انور'' اور اپنے ایک دوست جسٹس (ر) تنویر احمد خان کے فرزند ڈاکٹر عامر کے لیے ادبی رنگ میں تین سہرے تحریر کیے ہیں، وہ بھی بہت خوب ہیں۔

مجموعی اعتبار سے جسٹس (ر) میاں نذیر اختر اپنے افکارِ عالیہ کی ابلاغی ترسیل بہت خوبی سے کرتے ہیں۔ ان کے اندازِ بیان میں محض لفظوں کی بازی گری یا ہیئتی تجربات کی شعبدہ بازی نظر نہیں آتی۔ وہ اظہارِ خیال کے لیے سہل، شُستہ اور رواں بحور کا انتخاب کرتے ہیں جن کا قارئین کے احساسات پر براہِ راست اثر ہوتا ہے۔ ایسے میں ان کا قاری بجا طور پر اپنے سینے میں ان کے دل کی دھڑکن محسوس کرنے کے خوشگوار تجربے سے گزرتا ہے۔ توقیرِ حرف کی کمال درجہ پاسدار شاعری کی تخلیق پر میں مصنّف کتاب زیرِ نظر کو دلی مبارک پیش کرتا ہوں۔

ڈاکٹر جعفر حسن مبارک

تازہ غزل

وہ جو ہوتے تھے کبھی دور کے ناداروں میں
وقت بدلا تو وہ شامل ہوئے زرداروں میں
کل معزز جو بنے بیٹھے تھے درباروں میں
آج کھاتے ہیں وہ دھکے کبھی بازاروں میں
آپ چاہیں تو اسے ان کی بھی شہرت کہہ لیں
تھے جو مشہور کبھی ملک کے غداروں میں
اُنگلیاں جن پہ اُٹھانا تھا کبھی سوءِ ادب
ہاتھ اب اُن پہ اُٹھائے گئے بازاروں میں
بیچ دیتے ہیں جو قرطاس و قلم کی حرمت
عہدِ نو میں وہ گنے جائیں قلمکاروں میں
اپنا منصب نہیں، بھاتی تھی سیاست جن کو
ایسے نااہل بھی شامل رہے سالاروں میں
اب تو پردوں میں نہیں راز کسی حاکم کے
جابجا نصب ہیں اب کیمرے دیواروں میں
شیرِ مادر کی طرح قرض جو پی جاتے ہیں
خوشہ چیں، ایسے بھی شامل تھے کبھی یاروں میں
بن کے حاکم جو بھریں اپنے خزانے اختر
ایسے کم ظرف رہے قوم کے سرداروں میں

جسٹس (ر) میاں نذیر اختر/لاہور

اڈویسی کے اساطیری کردار

شاکر کنڈان/راولپنڈی

۱۔ اریز(Ares): جنگ اور ہمت کا دیوتا۔ جو بارہ اولمپوی میں سے ایک ہے۔ زیوس اور ہیرہ کا بیٹا ہے۔

۲۔ اپالو: یونانی دیو مالا کا حسین ترین دیوتا۔ زیوس اور لیٹونا کا بیٹا۔ ہومر کی داستان میں اس کی پیش گوئی سچ ثابت ہوئی۔ یونانی شاعری اور بعد کی مصوری میں اس کے حسن و جمال کی بڑی ثنا خوانی کی گئی۔

۳۔ ایتھنی: یونانی دیو مالا کی ایک دیوی۔ بعض محقق اسے زمانہ ویدک کی ایک دیوی سرسوتی کا ثنی بتاتے ہیں۔ ایتھنز اس کا شہر تھا اسی وجہ سے اس نے ٹروجن کی جنگ میں ایتھنز کی حمایت کی تھی۔

۴۔ ایفرودیت(Aphrodite) یونانی دیو مالا میں حسن و محبت کی دیوی، جسے وینس یا زہرہ بھی کہا جاتا ہے۔ عشق و محبت، حسن زرخیزی جنسی فعل اور نسلی تسلسل کی دیوی تھی۔

سنتے ہیں دو فرشتے ابھی تک اسیر ہیں

۵۔ اوشیانس(Oceanus) یا رب البحر: کلاسیکی عہد میں ایک ربانی یا خدائی شخصیت۔

۶۔ زیوس(Zeus): یونانی دیو مالائی دیوتاؤں میں سب سے عظیم دیوتا۔ اساطیر میں اسے دیوتاؤں کا بادشاہ تصور کیا جاتا ہے۔ اسپارٹا میں اسے پوجنے کے لئے ایک مندر تعمیر کیا گیا تھا۔

۷۔ کرکی یا سرسی۔ یونانی افسانوں میں ایک جادوگرنی اور ایک معمولی دیوی ہے۔ جادو کی چھڑی سے اپنے دشمنوں کو جانوروں میں تبدیل کر دیتی ہے۔

۸۔ پوسائیڈن: یونانی اساطیر کے بارہ اولمپیہ دیوتاؤں میں سے ایک تھا اس کے دائرۂ اختیار میں سمندر تھے۔ یہ زمین کو بھی لرزا سکتا تھا۔ یعنی زلزلہ لا سکتا تھا۔

۹۔ ہیرہ: یونانی دیو مالاؤں میں خداؤں کے بادشاہ زیوس کی بیوی اور بہن تھی۔ وہ گھروں کی خدا تھی۔

۱۰۔ ہیفیستوس۔ زیوس اور ہیرہ کا بیٹا۔ مجسمہ سازی، دھات کاری نیز آگ کا دیوتا تھا۔

۱۱۔ ہیلن (ہیلن آف ٹرائے۔ Helen of Troy): تیرھویں اور بارھویں صدی قبل مسیح میں جنگ ٹروجن (ٹرائے کی جنگ) اسی کے باعث تین ٹرائے دیوتاؤں کے درمیان لڑی گئی۔ ٹرائے کا شہر تباہ ہوا۔ ہومر نے اس جنگ سے متعلق کئی غیر فانی نظمیں لکھی ہیں۔ شاہ مینی لاؤس کی بیوی اور دنیا کی تمام عورتوں میں خوبصورت تھی۔ پارس آف ٹرائے اسے بھگا کر لے گیا تھا۔ جو جنگ کا باعث بنا۔

۱۲۔ ہیلیوس: یونانی اساطیر میں سورج کا دیوتا

ان کے علاوہ مشتری: سورج کا باپ، مزوا دیوی، کیلپسو دیوی، پولی فیمس دیو یا اور پینی لوپیا، ٹیلی ماکوز، منیلاؤس، الکینوس وغیرہ کے نام شامل ہیں۔ جب کہ اوڈیسیس اس نظم کا مرکزی کردار ہے۔

اوڈیسی کے موضوعات:

۱۔ تجسس ۲۔ کوشش ۳۔ تواضع ۴۔ دیوتاؤں کی مدد ۵۔ بھیس بدلنا ۶۔ تلاش ۷۔ جلاوطنی ۸۔ ہجرت ۹۔ کتھارسس ۱۰۔ محبت ۱۱۔ جنگ

ہومر اور اوڈیسی کا مطالعہ

ماضی بعید کی کسی تحریر کو جب بھی کھنگالتے ہیں اور اس پر اپنے نظریات اور خیالات کے مطابق تبصرہ کرنا چاہتے ہیں تو اختلافات کا پایا جانا کوئی بعید نہیں۔ بعینہٖ ہومر اور اوڈیسی کو جب ہم مختلف محققین کی نظر سے دیکھتے ہیں تو الجھن کا شکار ہو جاتے ہیں کیوں کہ اکثر محققین کی رائے ایک دوسرے سے الگ دکھائی دیتی ہے۔

ہومر کون تھا اور اس کا عہد کون سا ہے؟ اس پر ایک سوالیہ نشان ہے۔

ہومر کا اصل نام کیا ہے؟ اس پر بھی ایک سوالیہ نشان ہے۔

اوڈیسی کی حقیقت کیا ہے؟ اس پر ایک سوالیہ نشان ہے۔

اوڈیسی کس دور میں لکھی گئی؟ اس پر ایک سوالیہ نشان ہے۔

یہ وہ بنیادی سوال ہیں جن پر بات کرنا میں ضروری سمجھتا ہوں کیوں کہ یہ وہ سوال ہیں جو ہومر اور اوڈیسی کے مطالعے کے دوران بار بار سر اٹھاتے رہیں گے جس سے ہومر اور اوڈیسی کا مطالعہ کرنے کے باوجود بھی ہم الجھے رہیں گے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان سوالات کے جواب دینا ناممکنات میں سے ہے۔ کیوں کہ صدیوں کی گرد کو جھاڑنا اور اصلیت کو نکال لانا اتنا بھی سہل نہیں۔

سب سے پہلے ہم پہلے سوال کو دیکھتے ہیں کہ ہومر کون تھا اور اس کا عہد کون سا ہے؟ تو اس بارے میں مرزا حامد بیگ کا ایک مضمون جو ریختہ نے کسی رسالے سے نقل کیا، ہماری مدد کر سکتا ہے۔ اس مضمون کے مطابق:

’’یونانی زبان میں ہومر کی آٹھ سوانح عمریاں ملتی ہیں جو اس وقت لکھی گئی تھیں جب یونان کے لوگ صرف کہانی سے نہیں کہانی کہنے والے کی ذات سے

بھی دلچسپی لینے لگے تھے۔ زیادہ تر سوانح عمریوں میں ہومر کو ایک اندھا غریب گویا بتایا گیا ہے جو اپنا پیٹ پالنے کی خاطر در در کی ٹھوکریں کھاتا پھرا۔۔۔ پہلی صدی عیسوی کا یونانی مؤرخ ہیروڈوٹس لکھتا ہے کہ ہومر حضرت مسیح سے ساڑھے آٹھ سو برس پہلے کا آدمی ہے۔ جب کہ دیگر مؤرخ گیارہویں صدی پیشتر مسیح کے زمانے کو ہومر کا عہد قرار دیتے ہیں۔ ہومر کی جائے پیدائش سے متعلق بھی اختلاف ہے۔ چناں چہ ایک یونانی شاعر نے طنز کرتے ہوئے لکھا ہے کہ 'سات مردہ شہر ہومر کی جائے پیدائش ہونے کے دعویدار ہیں۔ جہاں زندہ ہومر بھیک مانگتا پھرا تھا۔'' [۱]

یاسر جواد نے اندازاً نویں صدی قبل مسیح [۲] ٹام پین (Tom Payne) نے آٹھویں صدی قبل مسیح [۳] جب کہ ہومر کے نام اور مقامِ پیدائش کے بارے میں اختلافات کو نظر انداز کرتے ہوئے مرزا حامد بیگ ہیروڈوٹس کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

''یونان کے شہر کیومی سے کچھ لوگ قدیم زمانے سے نقلِ مکانی کر کے ایشیائے کوچک کے مغربی ساحل پر جا بسے تھے۔ اُن لوگوں میں ایک مفلس شخص مینا پولوس تھا جس کی اکلوتی بیٹی کا نام کریتھائیس تھا۔ وہ ابھی بہت چھوٹی سی تھی کہ اس کا باپ مر گیا۔ مینا پولوس نے مرتے وقت اپنی بیٹی کو کلینا کس شخص کی سپرداری میں دے دیا تھا۔ لیکن کلینا کس نے ایمان داری سے کام نہ لیا اور اس لڑکی سے ہم صحبت ہوا۔ پھر بدنامی کے ڈر سے کریتھائیس کو ایک قافلے کے ہم راہ سمرنا بھیج دیا۔ اُس وقت وہ حاملہ تھی۔ سمرنا میں کریتھائیس کا ایک بیٹا پیدا ہوا جس نے ہومر کے نام سے شہرت پائی۔ دریائے میلس کے کنارے ہومر نے جنم لیا تھا۔ اس لئے اس کا نام میلے سیگنس رکھا گیا اور وہ بے باپ کا مشہور ہوا۔'' [۴]

ذہن میں ہومر کہلائے جانے کی وجہ تسمیہ یہ آتی ہے کہ جب اس نے اپنی حمدیہ نظم اپالو کی مدح میں لکھی تو وہاں کی لڑکیوں نے اسے بہت سراہا۔ چوں کہ وہ ہومر کے نام سے انجان تھیں۔ انہوں نے سوال کیا کہ ''یہ نظم کس کی ہے؟'' تو ہومر نے ان سے کہا کہ اگر کوئی تم سے اس بارے میں پوچھے تو کہہ دینا کہ 'وہ ایک اندھا (Homerous) شاعر ہے جس کا ٹھکانہ کہیں Chios کی پہاڑیوں میں ہے۔ اُس کے لکھے ہوئے اشعار اور گیت لوگ شوق سے سنتے ہیں۔ ممکن ہے اُن لڑکیوں کے لفظ ہومروس کی ادائی کو سننے والوں نے ہومر سمجھ لیا ہو اور اسے ہی اُس شاعر کا نام سمجھنے لگے ہوں۔

اس کے برعکس ہومر کے سوانح نگاروں میں سے کچھ نے توضیحات کا سہارا لیتے ہوئے اسے سمرنا شہر کے نیچے بہنے والے دریائے میلس کا بیٹا بتایا ہے اور لکھا ہے کہ اس کی ماں ایک دریائی پری تھی جس کا نام کریتھائیس تھا۔ زیادہ تر مؤرخین نے تو تاریخ کی خاموشی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے لاعلمی کا اظہار کر دیا۔ ہومر کی پوری زندگی عجائبات سے بھرپور ہے۔ یوں لگتا ہے کہ دیو مالائی سے گزر رہے ہوں۔ اس کا جنم، اس کی شادی، اس کی وفات، اس کی کتب کو زمانے کے غبار نے یوں ڈھانپ لیا ہے جیسے اساطیری کہانیوں نے دوبارا جنم لے لیا ہو۔

احمد عقیل روبی اس کی وفات کے بارے میں رقم طراز ہیں کہ:

''(ہومر) ایک بار ڈلفی کے مندر میں پہنچا جہاں عام آدمی کی آواز پر دیوتا اس کے سوال پر جواب دیتے تھے۔ یہ دیوتا اپالو کا مندر تھا۔ ہومر نے اس سے پوچھا 'میرا آبائی شہر کون سا ہے؟' غیبی آواز نے جواب دیا 'تم وہاں مرو گے جہاں بیٹھے لڑکوں کی پہیلی تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گی۔' چناں چہ ہومر جب بوڑھا ہو گیا تو وہ اپنے سالے سے ملنے آیوس (IOS) گیا اور اس کی ملاقات سمندر کے کنارے بیٹھے لڑکوں سے ہوئی جو مچھلیاں پکڑ رہے تھے۔ ہومر نے ان سے پوچھا: 'اے بچو! کیا جال میں کوئی مچھلی پھنسی؟' لڑکوں نے جواب دیا: 'جو کچھ ہم نے شکار کیا ہے وہ ہم چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ جو نہیں شکار کیا وہ لے کر جا رہے ہیں۔' یہ بات ہومر کی سمجھ میں نہ آئی لیکن اسے دیوتا کی بات یاد آ گئی۔ وہ وہاں سے اٹھا اور دور جا کر دلدل میں گر گیا اور تیسرے دن فوت ہو گیا۔ اسے آیوس (IOS) میں دفن کیا گیا۔ اس کی قبر پر آج تک یہ کتبہ لگا ہوا ہے۔

ہومر کی وجہ شہرت اس کی دو طویل (Epics) ہیں جن کی وجہ سے وہ ہر عہد کا بڑا مصنف اور لکھاری مانا جاتا ہے۔ ان نظموں میں اگر چہ وہ یونانی بہادروں کی جرأت، شجاعت، بہادری اور انسان دوستی کی مدح سرائی کرتا ہے۔ یونانی ثقافت اور طویل طرزِ زندگی کے نقشے کھینچتا ہے۔ لیکن یہ سب کچھ اس اسلوب میں بیان کرتا ہے کہ قدیم اور جدید لکھنے والے اسے سر جھکا کر نذرانہ عقیدت پیش کرتے ہیں اور برملا کہتے ہیں کہ 'ہومر یونان ہے اور یونان ہومر ہے'۔ ہومر بلاشبہ آج، گزرے کل اور آنے والے کل کا ایک عظیم لکھاری ہے۔ داستان گوئی کے سارے گُن، ہنر اس کی شاعری میں موجود ہیں۔ ورجل نے اپنی عظیم نظم 'اینیڈ' لکھنے کے لئے اس کا انداز اپنایا۔ اور اس کی نظم ایلیڈ کے بچے کھچے کردار کہانی کے لئے انتخاب کیے۔ دانتے ورجل سے متاثر ہوا اور اسے استاد مانا جو اصل میں ہومر ہی کا اعتراف ہے۔'' [۵] دیگر ناقدین نے لکھا ہے کہ ایتھنز جاتے ہوئے سارس کے جزیرے میں اس کی بہت قدر افزائی ہوئی اور انعامات سے

CS CamScanner

نوازا گیا۔ موسمِ بہار میں وہ ایتھنز پہنچنے سے پہلے جزیرہ یوس میں سخت بیمار ہو گیا اور وہیں وفات پائی۔

اوڈیسی کو کسی نے سفر نامہ لکھا ہے تو کوئی اسے جنگ نامہ کہتا ہے اور کسی نے اسے اوڈیسیس کی روداد قرار دیا ہے۔ اگر میں محمد بخش کی مثنوی سیف الملوک کا مطالعہ کریں تو بالکل ایسے ہی واقعات وہاں شہزادہ سیف الملوک کے ساتھ پیش آتے ہیں۔ بدیع الجمال کو پانے کے لئے نہ جانے وہ کیسی کیسی مصیبتوں سے گزرتا ہے۔ اگر اُس نکتۂ نظر سے دیکھیں تو اوڈیسی ایک داستان ہی ہے جن میں اساطیری حوالے بہت زیادہ ہیں۔ مافوق الفطرت نظارے بھی بہت ہیں اور کچھ حقیقتیں بھی ہیں۔ میرے خیال میں اسے اگر ایلیڈ کا تسلسل یا دوسری جلد کہا جائے تو اس میں کوئی اچنبھے والی بات نہیں ہونی چاہیے۔ کم از کم میں اسے اطہر پرویز کی نگاہ سے نہیں دیکھ سکتا کہ اس میں ''سچائی اور سادگی ہے''۔ البتہ اس بات سے اتفاق ہے کہ: ''ایسا نہیں ہے کہ یونانیوں نے دوسرے لوگوں کے مقابلے میں کم اصنام تراشے ہیں۔ کم جھوٹ بولا ہے۔ بل کہ شاید اوروں سے زیادہ۔'' لیکن پھر اس کا یہ کہنا کہ ''اُن کے اصنام میں، اُن کے جھوٹ میں زندگی کی بڑی سچائیاں ہیں''۔[٦]

اوڈیسی کے بارے میں ناقدین کا ہاں یہ بھی تشکیک کا پہلو نمایاں ہے کہ آیا یہ ہومر کی تحریر ہے بھی یا نہیں اور کیا یہ واقعی کسی ایک شاعر کی تخلیق ہے یا ویدوں کی طرح کئی لوگ کئی سال تک اسے لکھتے رہے۔ اگر چہ حامد بیگ نے تو یہ لکھ دیا کہ: پہلی صدی عیسوی میں اس کا پہلا ترجمہ منظرِ عام پر آیا لیکن ناقدین کا کہنا ہے کہ اوڈیسی سینہ بہ سینہ سفر کرتی رہی اور پہلی بار کئی سو سال بعد (گیارہویں، بارہویں یا چودھویں صدی عیسوی) یہ کتابی صورت میں شائع ہوئی۔ ایک یہ بھی روایت ہے کہ ۵۰ قبل مسیح کے لگ بھگ ہومر کی دو طویل نظموں یعنی ایلیڈ اور اوڈیسی کو کتب خانہ اسکندری کے ناظم ارستا خوس نے مشہور تاریخ دانوں اور محققین کی مدد سے ترتیب دیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں بہت زیادہ اختلاف پیدا ہوئے۔ اس پر تحقیق سے یہ بات بھی سامنے آئی کہ نہ تو اس کی زبان ہومر کے عہد کی ہے اور نہ ہی رسم و رواج اور معاشرت اُس عہد کی ہے۔

اوڈیسی کا مطالعہ:

اوڈیسی ایک رزمیہ ہے۔ اس منظوم قصے میں ایک ہزار (۱۰۰۰) قبل مسیح تا آٹھ سو (۸۰۰) قبل مسیح یونانی مطلق العنان حکمرانوں کے اہلِ ٹرائے پر غلبہ پانے کے بعد واپسی کے سفر کو اور چوں کہ اوڈیسیس اس قصے کا مرکزی کردار ہے جس کے ہاتھوں غلطی سے سمندر کے دیوتا کے بیٹے کی بینائی ضائع ہو جاتی ہے۔ جس سبب اسے مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے سو وہ پیش آنے والی مشکلات کو جس بہادری اور جواں مردی سے برداشت کرتا ہے اُسے زیرِ بحث لایا گیا ہے۔

اوڈیسیس کے سفر کے باعث ہم کئی تہذیبوں سے آگہی حاصل کرتے ہیں اور کئی ملکوں، جزیروں اور قوموں کے رسم و رواج سے واقفیت حاصل کرتے ہیں۔ جن میں قدیم یونان، سائکون اور کلکوپس، راس مالیا جزیرہ لاموس، جزیرہ اوگی گیا، جزیرہ ضیا کیا اور پاتال، عالمِ بالا پر زیوس دیوتا کے دربار (دیوتا کونسل) وغیرہ شامل ہیں۔

اس قصے کا پس منظر کچھ یوں ہے کہ ایشیائے کوچک کی ایک سلطنت ٹرائے کے حکمران پریام کے چھوٹے بیٹے پارس نے سپارٹا (یونان) کے سردار مینلاؤس کی حسین و جمیل بیوی ہیلن کو مع مال و اسباب اغوا کر لیا۔ اس بے عزتی کا بدلہ لینے کے لئے مینیلاؤس نے یونان کے تمام سرداروں کو اکٹھا کر کے بحری راستے سے ٹرائے پر دھاوا بول دیا۔ اس جنگ میں اتھاکا کا جنگ جو سردار اوڈیسیس بھی شریک ہوتا ہے۔ دس سالہ جنگ کے بعد جب وہ واپسی کا سفر اختیار کرتا ہے تو اوڈیسیس کے ہاتھوں سمندر کے دیوتا پوسائیڈن کے بیٹے سکلوپ کی بینائی جاتی رہتی ہے جس کی پاداش میں وہ دیوتاؤں کے غضب کا شکار ہو جاتا ہے اور مارے مارے پھرتا ہے۔ پہلے وہ ایک سمندری طوفان میں پھنس کر ایک جزیرے میں جا اترتا ہے۔ الغرض دس سال اسے اس سفر میں لگ جاتے ہیں۔ اس کے شہر کے لوگ سمجھتے ہیں کہ اوڈیسیس مر چکا ہے۔ سوار دگرد کے شہزادے اس کی بیوی پینی لوپیا سے شادی کرنا چاہتے ہیں اور وہیں ڈیرے جما لیتے ہیں۔ لیکن وہ کسی نہ کسی طرح انہیں اس مقصد سے دور رکھتی ہے۔ اوڈیسیس کا بیٹا ٹیلی ماکوز اب جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ چکا ہوتا ہے۔ اُدھر عرش پر تمام دیوتاؤں کے باپ زیوس کے ہاں دیوتا کونسل کا اجلاس ہوتا ہے۔ سمندر کا دیوتا پوسائیڈن اس میں سے غیر حاضر پایا جاتا ہے۔ حکمت کی دیوی ایتھنی اس سے اجلاس میں اوڈیسیس کے گناہ کے بارے میں سوال کرتی ہے کہ وہ آخر جزیرے میں کیوں سزا کاٹ رہا ہے۔ ایتھنی دیوی نے اوڈیسیس کے بیٹے ٹیلی ماکوز سے ملاقات کی اور اسے یقین دلایا کہ اوڈیسیس ضرور واپس آئے گا۔ ایتھنی نے ہی ایک جہاز کا بندوبست کیا اور ٹیلی ماکوز پائلوس کے راستے اسپارٹا پہنچا۔ وہاں شاہ مینیلاؤس نے ایک دعوت کے دوران اسے بتایا کہ اوڈیسیس زندہ ہے اور ایک جزیرے میں کیلپسو دیوی کے مجبوراً وقت گزار رہا ہے۔ واپسی پر ٹیلی ماکوز کو مینیلاؤس نے بہت سے تحفے دیئے۔

CamScanner

اُدھر اوڈیسیس سائکون کے ملک میں تھا جو یونانیوں کے خلاف تھے۔وہاں سے بمشکل وہ جان بچا کر سمندر میں آ گیا لیکن راس مالیا کے مقام پر اسے پھر طوفان نے آ لیا۔نو(۹) دن تک طوفان کا مقابلہ کرنے کے بعد اس کا جہاز ایک جزیرے کے ساحل پر جا لگا۔شام کو وہ ایک غار میں دوستوں کے ساتھ آرام کر رہا ہوتا ہے کہ شور سنتا ہے۔ان کی غار میں ایک یک چشمی دیو داخل ہوتا ہے اور اس کے چار پانچ ساتھیوں کو کھا کر سو جاتا ہے۔اس دیو کا نام پولی فیموس تھا۔وہ صبح غار کے منہ پر پتھر رکھ کر چلا جاتا ہے۔واپس آتا ہے تو اوڈیسیس اسے شراب پلا کر بے ہوش کر دیتا ہے اور پھر اس کی آنکھ میں سلاخ مار کر اندھا کر دیتا ہے۔وہاں سے وہ نکلنے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور ہواؤں کے دیوتا اوکیوس کے جزیرے میں پہنچتا ہے۔وہاں سے لاموس جزیرے میں چلا جاتا ہے جہاں اس کی ملاقات کرکی جادوگرنی سے ہوتی ہے۔وہ اُسے جہاز کے ذریعے پاتال میں پہنچا دیتی ہے۔پاتال میں وہ روحوں کو دیکھتا ہے جن میں کئی معروف لوگوں کے ساتھ اُس کی ماں کی روح بھی ہوتی ہے وہاں سردار اگ ممنون اُسے ہدایت کرتا ہے کہ اپنی پاک دامن بیوی کے علاوہ کسی پر اعتماد نہ کرنا۔جب وہ دوبارہ کرکی جادوگرنی کے پاس پہنچتا ہے تو وہ اسے سورج دیوتا کی سرزمین کی طرف روانہ کر دیتی ہے لیکن دو سو کوس کے بعد جہاز ران ہمت ہار بیٹھے اوڈیسیس نے انہیں حوصلہ دیا۔آگے گئے تو سکلا جادوگرنی نے چھ گردنوں والا سر باہر نکالا اور چھ آدمیوں کو اچک لیا۔سورج دیوتا (ہیلیوس) نے اپنے باپ مشتری سے اس کی شکایت کی۔ایک ماہ بعد اوڈیسیس اور اسکے ساتھیوں کو اتھاکا کی طرف روانہ کر دیا گیا۔سمندر میں پھر طوفان اٹھا۔جہاز ران پانی میں گر گیا۔یوں سب مر گئے لیکن ایک اوڈیسیس جو ایک ٹوٹے ہوئے مستول کو مضبوطی سے تھامے ہوئے تھا وہ نو(۹) دن رات پانی میں بھٹکنے کے بعد جزیرہ اوگی کیا کے ساحل پر جا لگا۔جہاں کیلپسو دیوی سے اس کی ملاقات ہوئی۔کیلپسو دیوی نے محبت کا جال بچھایا لیکن اوڈیسیس اس میں نہ پھنسا۔آخر اتھنی دیوی نے اسے جہاز مہیا کیا۔کیلپسو دیوی نے بہت سے تحائف دیئے اور اسے الوداع کہہ دیا۔نئی سرزمین پر نوسیکا کا بادشاہ الکینیوس نے اس کی خوب خاطر مدارات کی اور کچھ دنوں بعد اوڈیسیس کو وطن کی طرف روانہ کر دیا۔اوڈیسیس اپنی سرزمین پر پہنچ کر اسے پہچان نہ پایا۔اسے مزوا دیوی گڈریا کے روپ میں نظر آئی جس نے اُس کی آنکھوں کو دھویا تو اوڈیسیس نے اپنے وطن کو پہچان لیا۔مزوا دیوی نے اس کو تمام حالات سے آگاہ کیا اور اس کا لباس تبدیل کر کے ایک فقیر کے روپ میں اسے شہر کو روانہ کر دیا۔

اوڈیسیس فقیروں کی حالت میں گلہ بان سے ملا اور پھر اس کا بیٹا ٹیلی ماکوز اسے آن ملا اور بتایا کہ میں تیرا باپ اوڈیسیس ہوں۔جب محل میں پہنچا تو وہاں شہزادوں کو دیکھا جو ضیافتیں اڑا رہے تھے۔وہ خفیہ راستے سے اندر داخل ہوا اور پینی لوپیا سے کہا کہ اوڈیسیس زندہ ہے اور جلد تجھے آ ملے گا۔صبح محل جب چاہنے والے شہزادوں سے بھر گیا تو اوڈیسیس کی کمان وہاں لائی گئی کہ اسے کھینچا جائے لیکن سارے ایک ایک کر کے ناکام ٹھہرے۔آخر میں اوڈیسیس نے ایک تیر چڑھا کر کھینچا اور تیر انٹینوس کے حلق سے پار کر دیا۔دوسروں نے ہتھیار اٹھانا چاہے تو مزوا دیوی نے انہیں اندھا کر دیا۔

محل میں خادموں نے پینی لوپیا کو اوڈیسیس کے آنے اور تمام عشاق کے مارے جانے کی خبر دی۔دونوں کی ملاقات ہوئی اور اہلِ اتھاکا کو اطلاع ملی تو انہوں نے خوب جشن منایا۔

اوڈیسی کو کل پچیس ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ جو درج ذیل ہیں:

(۱)اوڈیسیس کا گھر (۲)ٹیلی ماکوز کا سفر(۳) ٹیلی ماکوز اسپارٹا میں (۴)اوڈیسیس اور کیلپسو(۵) اوڈیسیس اور طوفان (۶) اوڈیسیس فیشیا میں(۷)اوڈیسیس کی کہانی (۸)کنول کھانے والوں کی سرزمین سے سائیکلوپس کے جزیرے تک (۹)اے اولین کے جزیرے میں (۱۰)اوڈیسیس اور سرس

(۱۱)اوڈیسیس کی روحوں سے بات چیت(۱۲)اوڈیسیس کا اسکائیلا اور کیریڈس کے راستے سے گزرنا(۱۳) آخری خطرہ(۱۴)اوڈیسیس کا فیشیا سے رخصت ہونا اور اتھاکا پہنچنا (۱۵)اوڈیسیس اپنے گلہ بان کے گھر میں (۱۶)اوڈیسیس اور ٹیلی ماکوز کی ملاقات(۱۷) اوڈیسیس اور پینی لوپیا (۱۸)اوڈیسیس اپنے گھر میں اجنبی

(۱۹) اوڈیسیس اور ارس(۲۰) پینی لوپیا کا فیصلہ(۲۱)اوڈیسیس گھر کے اندر(۲۲) بدمعاشوں کا آخری دن(۲۳) قتلِ عام(۲۴) لاشیں ہی لاشیں(۲۵) پینی لوپیا کشمکش میں

اعلانِ درستگی

ماہنامہ ''ارژنگ'' کے قارئین مطلع کیا جاتا ہے کہ ماہ مارچ 2024 کے ارژنگ میں "شفیق" تخلص کرنے والے محترم دوست شاعر کی نعت کے آخر میں کمپوزنگ کی غلطی سے شاعر کا نام عبدالوحید بسمل لکھا گیا تھا جب کہ یہ ان کی نعت نہیں تھی۔لہٰذا درستگی کا اعلان کیا جاتا ہے۔

CamScanner

برصغیر پاک و ہند میں لسانی مد و جزر کا تاریخی، جغرافیائی اور سیاسی منظر نامہ

خاور اعجاز/اسلام آباد

لسانی مد و جزر ایک ایسا عمل ہے جو صدیوں غیر محسوس طریقے سے جاری و ساری رہتا ہے۔ برِ صغیر میں بھی یہ عمل مختلف مقامات پر اپنے فطری انداز میں وقوع پذیر رہا لیکن مسلمان فاتحین نے اِس عمل کو اِتنا تیز کر دیا کہ اِس کے آثار تھوڑے ہی عرصہ میں واضح ہونے لگے۔ مسلمانوں سے پہلے آریاؤں کی آمد نے ہند آریائی مخلوط زبان کی داغ بیل ڈال کر مقامی زبان کو مغلوب کیا تاہم محمد بن قاسم کی مختصر دورانیے کی مہم نے برِ صغیر کے لسانی جل میں پہلا کنکر پھینک کر اُن لہروں کی ابتدا ضرور کی جو بعد میں آنے والے مسلمانوں کی آمد سے دُور دُور تک پھیل گئیں۔ اِن لہروں میں سامانی سلطنت کے جرنیل الپتگین کی وفات کے بعد اُس کے ترکی النسل غلام سبکتگین کا ۹۷۸ء کے ارد گرد ہندوستان کی سرحد سے ملحقہ چند قلعے تسخیر کرنے اور مساجد تعمیر کرانے کا ذکر مِلتا ہے۔ سبکتگین کے بیٹے سلطان محمود غزنوی (دورِ حکومت ۹۹۸ء۔ ۱۰۳۰ء) کی پنجاب اور سندھ کے علاوہ قنوج، متھرا، گجرات، کالنجر، کاٹھیاواڑ اور گوالیار تک پہنچ اور ۱۰۲۱ء میں لاہور میں ملک ایاز کا بطور نائب تقرر کر کے پنجاب کو اپنی سلطنت میں شامل کرنا فارسی، ترکی اور عربی کی پنجابی اور دیگر مقامی بولیوں کے آمیختے سے رابطے کی ایک نئی زبان کی تشکیل کے خیال کو تقویت دیتا ہے۔ پنجابی اور اُردو میں آدھے سے زیادہ الفاظ اور دونوں زبانوں کی گرامر کے اہم اجزا کا مشترک ہونا اِس خیال کی مزید حمایت کرتا ہے۔ محمود غزنوی کی آمد نے محمد بن قاسم سے آغاز ہونے والے ہند اسلامی تمدن میں نئی روح پھونکی اور جدید دَور میں قدم رکھتی ہُوئی ہند آریائی زبانوں پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ ۱۰۲۲ء میں محمود غزنوی لاہور کو صدر مقام بناتا ہے تو ملتان کے مقابل لاہور کی اہمیت میں اضافہ ہونے لگتا ہے۔ ملک ایاز کے دَور میں لاہور تعلیمی اور ثقافتی سرگرمیوں کا مرکز بنا اور شعر و شاعری کا خوب چرچا رہا۔ ہندوی کے پہلے شاعر مسعود سعد سلمان کا لاہور سے تعلق اور اُن کے ہندوی دیوان کی امیر خسرو سے شہادت اُردو کی بطرزِ ''لاہوری'' موجودگی کو اور بھی قرینِ قیاس بناتی ہے۔ ۱۰۲۲ء میں ہی کالنجر کے راجا کا ہندی زبان میں ایک قصیدہ محمود غزنوی کو بھیجنا اِس امر کا اظہار ہے کہ وہ رابطے کی نئی زبان کی تشکیل میں ایک معاون کے طور پر خود کو متعارف کرانا چاہتا تھا۔

برِ صغیر میں پہلی مسلم حکومت کی بنیاد معز الدین محمد غوری (دورِ حکومت ۱۱۷۳ء۔ ۱۲۰۶ء) کے ہاتھوں پڑی۔ ۱۲۰۶ء میں محمد غوری کی وفات کے بعد قطب الدین ایبک کی جنوبی ایشیا کے پہلے مسلمان سلطان کی حیثیت سے تاجپوشی ہُوئی تو اُس نے لاہور کو اپنا دارالسلطنت بنایا۔ ایبک ادب کا سرپرست بھی تھا۔ فخرِ مدبر، جنھوں نے جنگ کے آداب پر ''آداب الحرب'' لکھی تھی، نے اپنی نسب نامہ کی کتاب کا انتساب ایبک کے نام کیا تھا۔ حسن نظامی نیشاپوری نے ''تاج المآثر'' کی ابتدا بھی ایبک کے زمانے میں کی تھی جو التتمش کے عہد میں مکمل ہُوئی۔ یہ کتابیں فارسی زبان میں ہیں۔

سلطان ناصر الدین محمود کے عہد میں منہاج الدین سراج کی تصنیف کی گئی ''طبقاتِ ناصری'' (۱۲۶۰ء) میں خال خال ہندوی الفاظ پائے جاتے ہیں۔ ناصر الدین کے عہد میں غیاث الدین بلبن معاملاتِ حکومت دیکھا کرتا تھا سو ناصر الدین کی اولاد نہ ہونے کے باعث بلبن ہی اگلا سلطان ہُوا۔ بلبن کے کچھ عرصہ بعد پورب کے علاقوں میں شیخ سعدی کی گلستان بوستان کی تعلیم کا ذکر مِلتا ہے جس کی تصدیق ڈاکٹر نذیر احمد کے دریافت کردہ شیخ حمید قلندر (م ۱۳۶۷ء) کے کچھ ایسے کلام سے ہوتی ہے جس کے بارے میں خیال ہے کہ سعدی کی نقل میں کہا گیا ہے۔ مملوک خاندان (۱۲۰۶ء۔ ۱۲۹۰ء) کے عہد میں مرکزی زبان ترکی اور انتظامی زبان فارسی رہی۔

خاندانِ غلاماں کے بعد خلجیوں کا دورِ حکومت آیا جو سلجوقوں، غوریوں اور مملوک خاندان کے لشکروں میں رہ چکے تھے۔ جلال الدین فیروز خلجی خاندانِ خلجی کا پہلا بادشاہ ہُوا لیکن اپنے بھتیجے اور داماد علاؤ الدین خلجی کے ہاتھوں قتل ہُوا۔ علاؤ الدین کے ہمراہ پورب کے لشکر کی زبان اور معاشرت نے دِلّی میں رواج پکڑا۔ اُس کی فتوحات نے کڑے اور اودھ کی زبان کو بہار، گجرات، دِلّی اور دیوگیر تک میں جاری کیا۔ امیر خسرو کی مثنوی قرانُ السعدین (۱۲۸۹ء) کڑے میں پیش آنے والے ایک واقعہ کی منظوم شکل ہے۔ اِس مثنوی میں اکثر ہندوستانی لفظوں کو مفرس کر لیا گیا ہے۔ ۱۲۹۷ء میں علاؤ الدین خلجی نے گجرات اور ۱۳۱۰ء میں دکن اور مالوہ فتح کر کے ہر موضع پر ایک نگران مقرر کیا جو امیر صدہ کہلاتا تھا۔ امیرانِ صدہ نے اہل و عیال سمیت دکن اور گجرات کو اپنا وطن بنایا۔ خلجی عہد (۱۲۹۰ء۔ ۱۳۲۰ء) میں

درباری رسرکاری زبان فارسی ، پھر عربی، ترکمانی اور کچھ شمالی ہندوستانی بولیاں تھیں۔ مختلف زبانوں کے اس ملغوبہ نے اُردو کی ابتدائی شکل کو جنم دینے میں ضرور کردار ادا کیا ہوگا۔ مزید برآں خلجیوں نے اُس وقت تک دِلّی اور اس کے نواحی علاقوں میں رواج پا جانے والی زبان کو گجرات اور دکن تک منتقل کیا۔

ملک فخر الدین محمد تغلق (دورِ حکومت: ۱۳۲۵ء۔۱۳۵۱ء) نے ۱۳۲۱ء اور ۱۳۲۳ء میں دیونگر، وارنگل اور بیدر کو نئے سرے سے زیر کیا اور جب وہ غیاث الدین تغلق کے بعد سریر آرائے سلطنت ہُوا تو اُس نے مالابار، مدورائی اور کرناٹک تک کو زیرِ نگیں کر لیا اور ۱۳۲۷ء میں دِلّی کی بجائے دیوگیر (دولت آباد) کو پایۂ تخت بنایا جس کے نتیجے میں اہلِ دِلّی کو ترکِ وطن کر کے دولت آباد منتقل ہونا پڑا تو دِلّی کے علمأ و شرفأ کے ساتھ معمولی پیشہ ور تک دکن پہنچے۔ جب دِلّی کی آبادی دیوگیر منتقل ہُوئی تو وہ لوگ جو زبان وہاں لے کر گئے اُس کی بنیاد کھڑی بولی تھی جس میں برج بھاشا، مہاراشٹری، قنوجی، ہریانی اور پنجابی کے علاوہ عربی ، فارسی اور ترکی زبانوں کے عناصر بھی شامل تھے۔ اِس ہجرت نے دکن کی تہذیب و تمدن کے علاوہ زبان کو بھی بہت متاثر کیا جس کے نتیجے میں جب بول چال کی زبان نے ترقی کی اور شعر و ادب میں استعمال ہونے کی سطح پر آ گئی تو گجرات میں ''گجری'' اور دکن میں ''دکھنی'' کہلائی۔ گجرات کا قدیمی نام گوجر راٹھ یعنی گوجروں کی مملکت ہے۔ سمندری راستے سے عربوں کے روابط گجراتیوں سے نہایت قدیم ہیں۔ دُوسری جانب گجرات اور شمالی ہند کے مابین آمد و رفت برابر جاری رہتی تھی۔ گجرات پر محمود غزنوی اور محمد غوری کے علاوہ علأ الدین خلجی کے سپہ سالار الغ خان اور ناصر الدین محمود شاہ تغلق کے زمانے میں امیر تیمور کے دِلّی پر حملہ کے نتیجے میں رعایا کے ساتھ بادشاہ کے بھی گجرات کی طرف فرار نے مشترک زبان کے رواج اور فکر و خیال میں ہم آہنگی کے مواقع فراہم کیے۔ اِن واقعات کے بعد مختلف مذہبی تحریکوں نے گجرات اور دیارِ شرق میں لسانی اور تہذیبی رابطوں کے لیے راہ ہموار کی۔

زبانِ دہلوی میں گجراتی الفاظ کے داخل ہونے کو بعید از قیاس نہیں کہا جا سکتا کیونکہ قطب الدین مبارک شاہ خلجی کے عہد میں عملاً سلطنت کا اختیار ملک خسرو خاں کے پاس تھا اور اُس نے لشکر میں چالیس ہزار گجراتی بھرتی کر کے بادشاہ کو قتل کیا اور اقتدار پر قبضہ کیا۔ ملک خسرو خاں کے زمانے میں، جو اصلاً گجرات کا باشندہ تھا، گجراتی زبان کا زبانِ دہلوی کو متاثر کرنا قرینِ قیاس ہے تاہم ۱۳۴۱ء کو دوآبہ میں شورشوں کے سبب پھر دِلّی مراجعت کی گئی۔ اِس عمل میں دِلّی کی زبان دولت آباد اور دولت آباد کی زبان دِلّی ضرور پہنچی ہو گی۔ محمد بن تغلق خود بھی فارسی، عربی، ترکی اور سنسکرت جانتا تھا۔ اُسی کے زمانے میں ابنِ بطوطہ ہندوستان آیا اور نو برس یہاں رہا۔

محمد تغلق کے آخری زمانے میں جب تغلق کمزور پڑے تو دولت آباد میں بغاوت ہُوئی۔ ہُوا یوں کہ محمد تغلق نے جب ملا نظام الدین، ملک احمد لاچین اور ملک علی کو امیرانِ صدہ سے مالیات کی فراہمی کا حکم دیا تو امیرانِ صدہ نے ملک احمد اور ملک علی کو قتل کیا اور نظام الدین سے قلعہ اور خزانہ کی چابیاں چھین کر قبضہ کر لیا اور اسماعیل مخ کو اپنا بادشاہ بنا لیا جو ناصر الدین شاہ کے لقب سے تخت نشین ہُوا۔ دو سال کے بعد جب دِلّی کی شکست خوردہ افواج واپس ہُوئیں تو امیرانِ صدہ نے متفقہ طور پر حسن محمد خاں کو ۱۳۴۷ میں بادشاہ مقرر کیا جو علأ الدین حسن بہمنی کے لقب سے تختِ شاہی پر متمکن ہُوا اور بیدر سے مغرب دولت آباد سے جنوب مشرق میں واقع شہر گلبرگہ آزاد بہمنی ریاست کی داغ بیل ڈالی ۔ اگر چہ بقو خانی خان یہاں کی زبان ''ہندوی'' قرار پائی بہمنی سلطنت میں فارسی کا دَور دورہ رہا اور کئی فارسی دانوں نے دکن میں مستقل سکونت اختیا جیسے مفتی احمد بردی، نصیر الدین تبریزی، میر محمد سیف الدین غوری، میر فضل اللہ انجو وغیرہ۔ شہا الدین احمد شاہ بہمنی کے دور (۱۴۲۲ء۔۱۴۳۶ء) شیخ ازری اصفہانی نے بہمن نامہ تصنیف کیا۔ و فردوسی کی طرز پر بہمنی خاندان کی منظوم تا ہے۔ دکن کی علمی تاریخ میں محمود گاواں (خواجہ گیلانی) ایک بڑا نام ہے ۔ ایک وقت تھا کہ دکن اُن کا کوئی مدِ مقابل نہ تھا۔ اُن کے خطوط کے ''ریاض الانشا'' اور فارسی تصنیف ''مناظر الانشا'' اُن کا شمار پندرھویں صدی عیسوی کے ممتاز مصنفین میں کرایا۔

تاج الدین فیروز شاہ بہمنی سلطنتِ بہمنی آٹھواں حکمران تھا۔ وہ علم و دانش اور شعر و سخن کا دل تھا۔ اُس نے فیروزی اور عروجی تخلصوں کے شاعری بھی کی۔ اُس کے دورِ حکومت میں خواجہ نواز ۱۴۰۱ء میں گلبرگہ پہنچے اور سلطان کی فرمائش یہیں سکونت اختیار کی۔ اُن کی تصنیف ''معر العاشقین'' قدیم اردو کی اولین تصنیف سمجھی ہے۔ اِس رسالہ میں بعد میں ترتیب پانے وا زبان کے اصوٗل وضوابط کا دھیان رکھنا ممکن نہ تھا اِس میں تذکیر و تانیث ، جمع بنانے کے قاعدے

حرفِ اضافت کے استعمال ہیں وہ خوبی نہیں جو اردو گرامر کے اصول وضع ہونے کے بعد پیدا ہوئی تاہم یہ رسالہ حضرت بندہ نواز کے سلسلۂ درس و تدریس کا ایک حصہ ہے اور لسانی اعتبار سے اردو کی اہم ترین تصانیف میں شمار ہوتا ہے۔اس رسالہ کو قدیم ترین اردو نثر پارہ بھی تسلیم کیا گیا ہے۔''معراج العاشقین'' مضامینِ تصوف پر مشتمل ایک رسالہ ہے جو مقامی ہندی یا دکھنی اردو بولنے والوں کی سہولت کے لیے لکھا گیا۔یہاں مذکورہ رسالہ کے اختتامی فقرے اُس عہد کی قدیم اُردو کا حال جاننے کی غرض سے درج کیے جاتے ہیں:

''پیر کوں درکار ہے دس چیز سمجھنا۔سو اس پر فرض ہوتا ہے اوّل علم اچھے دانائی کو بوج کا، دویم سخاوت اچھے دل کا، سویم تمل اپنے دانائی کا، چہارم مرید کے مال سوں طمع نا کرنا حرص کا، پنجم نادانی کی بات نا کرے مریداں میں، ششم عقل اچھے، ہفتم شجاعت اچھے، ہشتم یاد میں رہنا، نہم حال پر حال ہووے، دہم سو بوجھ کا مالک ہووے''۔

اسی عہد میں ''نشاط العشق'' کا قدیم دکھنی میں ترجمہ بھی ہوا۔

حضرت بندہ نواز کے والد حضرت راجو قتال حسینی، فرزند سید اکبر حسینی اور پوتے سید عبداللہ حسینی نے بھی دکنی رسائل مرتب کیے۔سید اکبر حسین خلف بندہ نواز دہلی میں پیدا ہوئے اور ۱۴۱۲ء میں گلبرگہ آئے۔اُن کے اشعار میں اس نوعیت کی زبان موجود ہے:

دھو کر زباں کو اپنی پیر سوں بیاں پر
بولوں صفت خدا کی کر شکر میں زباں پر
بے پیر جو مُوا تو نئیں ہے درست اس پر
پڑنا نماز جنازہ تو ہوئے گناہ اکبر

فخر الدین نظامی بیدری مثنوی ''کدم راؤ پدم راؤ'' کے مصنف ہیں اور بندہ نواز کے بعد قدیم دکھنی کے اولین شعرا میں سے ہیں۔اُنھوں نے یہ مثنوی نظام شاہ بہمنی کے عہد میں لکھی جو ۱۴۶۱ء تا ۱۴۶۳ء یعنی کل دو سال پر محیط ہے۔شاہ صدرالدین بہمنی عہد کے بزرگ صوفی شاعر اور مشتاق اور لطفی وغیرہ کے ہمعصر تھے۔تصوف پر مختلف تصانیف ہیں۔

صدر الدیں تو کسب پر ثابت اچھے
صرف سو صنعتوں کے نت ثابت اچھے
صدر الدیں پل پل میں یو بیکل ہُوا
وصل میں یک پل منجی میں حل ہُوا

مشتاق تخلص کے شاعر محمد شاہ بہمنی دوم کے عہد (۱۴۶۳ء۔۱۴۸۲ء) میں تھے۔دکھنی زبان میں ایک قصیدہ اور چند غزلیات دستیاب ہوتی ہیں۔تذکرہ نگاروں نے اُنھیں اپنے عہد کا باکمال اور استادِ سخن کہا ہے۔لطفی محولا بالا مشتاق کے ہمعصر تھے۔قصائد اور غزلیات کہیں۔ایک قصیدہ بہمنی دربار کے مقبول شاعر خواجہ کرمانی کی زمین میں بھی کہا۔

خلوت منے سجن کے مَیں موم کی بتی ہُوں
یک پاؤں پر کھڑی ہُوں جلنے پرت بنی ہُوں

میرانجی شمس العشاق تصوف میں قابلیت کی بنا پر شمس العشاق کہلاتے تھے۔اُن کی تصانیف میں شہادت الحقیقت، خوش نغز، خوش نامہ اور شرح مرغوب القلوب شامل ہیں۔محمود بحری کی مثنوی ''من لگن'' بھی اسی عہد بہمنی میں سامنے آئی۔بہمنی سلطنت (۱۳۴۷ء۔۱۵۲۷ء) میں سرکاری زبان فارسی تھی جبکہ دیگر مستعمل زبانوں میں دکنی، مراٹھی، کناڈا، تیلگو وغیرہ شامل تھیں۔

فیروز شاہ تغلق (دورِ حکومت: ۱۳۵۱ء۔۱۳۸۸ء) غیاث الدین تغلق کا بھتیجا تھا۔اُس نے جونپور، فیروز پور، حسار، فیروز آباد اور فتح آباد جیسے شہر آباد کیے اور اپنی ایک مختصر سوانح ''فتوحاتِ فیروز شاہی'' بھی تحریر کی۔اُس کے زمانے میں سنسکرت سے فارسی اور عربی میں تراجم ہوئے۔کئی کتابوں کے نسخے اُس کے ذاتی کتب خانے میں موجود تھے۔فیروز شاہ کے وزیرِ اعظم خان جہاں مقبول (ہندوانہ نام کنو) کا سلطان سکندر کے دربار میں بہ زبانِ ہندوی گفتگو کرنے اور اُس کے سمجھ جانے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوی زبان اُس زمانے میں بنگال تک پھیل چکی تھی۔

۱۳۹۴ء میں ناصر الدین محمود شاہ تغلق (دورِ حکومت: ۱۳۹۴ء۔۱۴۱۳ء) نے اپنے ایک امیر ملک سرور (لقب خواجہ جہان) کو ملک الشرق کا خطاب دے کر جونپور بھیجا اور قنوج تا بہار اُس کے سپرد کیا۔یہ سلطنتِ شرقیہ کا پہلا سلطان (۱۳۹۴ء تا ۱۳۹۹ء) ہُوا۔اِس سلطنت کے تیسرے سلطان ابراہیم شاہ شرقی (۱۴۰۲ء تا ۱۴۴۰ء) کے عہد میں دکن کے ملک العلماء شہاب الدین دولت آبادی منصبِ وزارت پر فائز ہوئے۔اِس تقرری نے دکن اور پورب کے مسلم معاشرے کے مشترکہ عناصر (بشمول زبان) کو اہلِ علم کی آمد و رفت کے نتیجے میں ہاتھ ملانے کے مواقع فراہم کیے۔

دکن میں دراوڑی قوم کی کئی زبانیں مستعمل رہیں لیکن خلجی اور تغلق حاکموں کی آمد سے رابطے کی نئی زبان تشکیل پانا شروع ہوئی جسے قدیم اردو کا نام دیا جا سکتا ہے۔زبان کے اِس ارتقائی عمل میں خلجیوں کی فتحِ دکن سے قبل کئی بزرگوں نے دکن کا رُخ کیا جن میں بابا سید مظہر عالم، بابا شرف الدین، بابا شہاب الدین حاجی رومی، سید احمد، سید شاہ مومن، شاہ درہ گنج

رواں اور قدیم حیات قلندر کے نام نمایاں ہیں جبکہ فتح دکن کے بعد اِدھر آنے والوں میں پیر مقصود، پیر جمن شاہ، زرزری بخش، شاہ برہان الدین غریب، شاہ راجو قتال، شیخ ضیا الدین، فتح الدین اور میر مٹھے قابلِ ذکر ہیں۔ تغلق خاندان (۱۳۲۰ء۔۱۴۱۳ء) کی سرکاری زبان فارسی تھی تاہم اس عہد میں دکنی زبان پر شمالی ہند کی زبان کے مستقل اور نمایاں اثرات مرتب ہُوئے جبکہ خاندانِ سادات (۱۴۱۴ء۔۱۴۵۱ء) کی سرکاری زبان بھی فارسی رہی۔

خاندانِ سادات کے شاہ عالم کی سبکدوشی پر عالم شاہ کے ایک وزیر حمید خان نے بہلول لودھی (دورِ حکومت: ۱۴۵۱ء۔۱۴۸۹ء) کو تختِ دِلّی سنبھالنے کی دعوت دی تو بہلول نے اپنی بادشاہت کا اعلان کیا۔ ۱۴۷۹ء میں جونپور میں موجود شرقی حکومت کو شکست دے کر اپنی سلطنت سے منسلک کر لیا اور ۱۴۸۶ء میں اپنے بیٹے بیرک شاہ کو جونپور کا وائسرائے مقرر کیا۔ جونپور کے سلطان محمود زرقی اور بہلول لودھی کے معرکوں میں دِلّی کے لشکری پورب میں جاتے اور قیام کرتے رہے نیز شرقی افواج کے سپاہی گرفتار ہو کر لشکرِ دِلّی میں آتے رہے۔ یہ پہلو زبان کی ترقی و ترویج کے سلسلہ میں اہم ہے۔

نظام خان سکندر لودھی (دورِ حکومت: ۱۴۸۹ء۔۱۵۱۷ء) نے ۱۵۰۳ء میں آگرہ شہر کی بنیاد رکھی اور بعد ازاں دارالحکومت دِلّی سے آگرہ منتقل کیا۔ اِس تبدیلی نے آگرہ اور مضافات کی بول چال اور دِلّی کی زبان کو میل ملاپ کا موقع فراہم کیا جس سے رابطہ کی مشترکہ زبان ''ہندی گوالیاری'' وجود میں آئی جو آگے چل کر برج بھاشا (مغربی اتر پردیش کی زبان) کے نام سے موسوم ہُوئی۔ برج بھاشا کو پہلی بار جہانگیر کے عہد میں ''ہندی گوالیری'' کہا گیا اور محمد شاہ کے وقت میں پہلی بار اس کو ''بھاکا لے برج'' کا نام دیا گیا۔ محمد شاہ شاعر بھی تھا، فارسی شعر کہتا اور گلرخ تخلص کرتا تھا۔ اُس کے زمانے میں ہندوؤں نے پہلی بار فارسی کی طرف توجہ کی تو سکندر لودھی نے ایسے اشخاص کو سرکاری ملازمتیں فراہم کیں۔ اُسی کے عہد میں سنسکرت کتابوں کا فارسی ترجمہ کیا گیا۔ لودھی خاندان (۱۴۵۱ء۔۱۵۲۶ء) کے عہد میں عدالت اور محصول کا ریکارڈ فارسی میں جبکہ عام زبان ہندوی یا کھڑی بولی تھی۔

دکھن کا علاقہ آریائی اور دراوڑی زبانوں کے اختلاط کا مرکز بنا۔ یہیں فارسی، مراٹھی، کنڑی اور تلنگی وغیرہ سے ایک نیا آمیزہ تیار ہُوا۔ شمالی ہند کے حملہ آوروں اور دکن کے مقامیوں کے میل جول سے جو جس نئی زبان کا ہیولہ مرتب ہونا شروع ہُوا وہ پہلے پہل دکھنی کہلائی۔ خلجیوں اور تغلقوں سے پہلے دولت آباد اور اُس کے قرب و جوار میں مراٹھی زبان کا رواج تھا سو خیال اغلب ہے کہ شمال سے فارسی بولتے ہُوئے آنے والوں کا پہلا سامنا یہاں کے مراٹھی بولنے والوں سے ہُوا۔ اِسی بلغوبے میں بہمنی سلطنت کے بعض علاقوں میں کنڑی اور بعض میں تلنگی بولنے والوں سے فارسی اور مراٹھی کے مشترک رویوں کے حامل افراد کے میل جول سے بول چال کی ایک نئی زبان کا آغاز ہُوا ہوگا۔ دُوسری طرف پنجاب کی قدیم زبان ملتانی نے اُردو کی ابتدائی صورت متعین کرنے میں بڑا کردار ادا کیا۔ اِس عمل میں غازی الدین ملک تغلق، والیِ دیپال پور کا ۱۳۲۰ء میں غیاث الدین کے لقب سے دہلی کا تخت سنبھالنا، ۱۴۱۳ء میں ملتان کے خضر خان کا دہلی پر قابض ہونا اور ۱۴۵۱ء میں ملتان سے خاندانی تعلق رکھنے والے بہلول لودھی کا سلطان دہلی بننا اہم واقعات ہیں۔ سندھ کی سرحد ملتان سے لے کر ٹھٹھہ کے سواحل تک پھیلی تھی۔ گیارھویں صدی عیسوی کی ابتدا سے آج تک ملتان پنجاب کا حصہ ہے۔ میرے خیال میں فارسی گو مسلمانوں کی پنجاب میں سکونت سے ایک سرے پر لاہوری اور دُوسرے سرے پر ملتانی نے جنم لیا اور اِس کی ادغامی صورت نے دہلی کی جانب سفر کیا۔ مغلیہ عہد میں اکبر بادشاہ (۱۵۴۲ء۔۱۶۰۵ء) کے حرم میں ہندو رانیوں کی آمد نے فارسی اور بھاشا کے اختلاط سے اُردو زبان کے بنتے ہُوئے آثار کو تقویت دی۔

اِس ساری گفتگو سے یہ منظر سامنے آتا ہے کہ سیاسی اکھاڑ پچھاڑ، جنگ و جدل، قبضہ و تصرف، جوگیوں اور صوفیوں کی آمد و رفت سے ایک علاقہ کے لسانی عناصر دُوسرے علاقہ میں منتقل ہوتے رہے۔ جن علاقوں میں اِن عوامل کا اثر کم رہا وہاں کی مقامی زبان پر گرد و نواح اور باہر کی زبانوں کے اثرات بھی کم رہے۔ جہاں ہمیں دیگر زبانوں میں ہندوی کے الفاظ نظر آتے ہیں وہاں برعکس نگاہ ڈالی جائے تو منظر یکسر تبدیل ہو جاتا ہے۔ گویا اَب تک اُردو زبان کی ہنڈیا میں کئی زبانوں اور بولیوں کے کچے عناصر پک کر کسی نئے سانچے میں ڈھلنے کے لیے اُلٹ پلٹ ہو رہے ہیں۔

❀❀❀

کشتگانِ خنجرِ تسلیم را
ہر زماں از غیب جانے دیگر است
(شیخ جام)

سندھ میں زندگی کے آخری ایام گزارنے والا مغل شہزادہ داراشکوہ

مرزا کاظم رضا بیگ

مورخہ 15 صفر المظفر سنہ 1024ھ کو اجمیر میں جب شاہجہان کو ممتاز محل کے بطن سے ایک لڑکا پیدا ہوا تو جہانگیر نے اس کا نام داراشکوہ تجویز کیا۔ ابوطالب کلیم سے گل اولین گلستانِ شاہی سے اس کی تاریخ ولادت نکالی۔ جب سنہ 1237ھ میں شاہجہان بیمار ہوا اور اس کی حالت تشویش ناک حد تک بگڑ گئی اور اس نے اپنے درباریوں کو بلا کر وصیت کی کہ اس کے بعد داراشکوہ کو حاکم بنایا جائے لیکن باپ کے اس فیصلے اور وصیت کے خلاف عالمگیر اپنے بھائیوں کی حمایت سے اٹھ کھڑا ہوا، جس کے نتیجے میں داراشکوہ نے 7 رمضان 1068ھ کو ساموگڑھ کے میدان میں عالمگیر کے لشکر کے ہاتھوں شکست کھائی اور اپنے اہل و عیال کے ساتھ فرار ہو کر دہلی پہنچا۔ عالمگیر نے 1068ھ کو اُسے قلعے پر قبضہ حاصل ہو گیا۔ اس کے حکم پر اس کے بیٹے محمد سلطان نے قلعہ میں داخل ہو کر اپنے جد بزرگوار شاہجہاں سے ملاقات کی اور 21 رمضان المبارک کے سنہ 1068ھ کو اسے نظر بند کر دیا گیا۔ داراشکوہ کو یہ صورت حال معلوم ہوئی اُس نے دس ہزار فوج لے کر دہلی کی جانب پیش قدمی کی۔ داراشکوہ نے لاہور پہنچ کر تین مہینہ پندرہ دن تک وہاں قیام کیا اور اس قیام کے زمانے میں لشکر کی تیاری کی اور بیس ہزار سے زیادہ سپاہی بھرتی کیے۔ عالمگیر نے دہلی پہنچ کر یکم ذی قعدہ سنہ 1068ھ کو اپنے جلوس کا اعلان کیا۔ مختلف امیروں کو انعام و اکرام دیا اور ایک ہفتہ کے قیام کے بعد داراشکوہ کے تعاقب میں لاہور کی طرف چل پڑا۔

داراشکوہ کو توقع نہیں تھی کہ عالمگیر لاہور کی طرف بڑھے گا۔ اس کے وقائع نویسوں نے اسے جب یہ خبر سنائی تو وہ لاہور سے ملتان کی طرف چلا آیا۔ وہاں وہ اپنے قیام کو خطرہ سے خالی نہیں سمجھتا تھا۔ چنانچہ اس نے وہاں پہنچتے ہی فیروز نامی شخص کی نگرانی میں اپنے تمام خزانے اور ضروری ساز و سامان کشتی کے ذریعے بکھر بھجوا دیا۔ اس نے خود ملتان سے بکھر کی راہ لی۔ عالمگیر لاہور پہنچنے کے ارادے سے مومن پور میں خیمہ انداز تھا کہ اُسے اطلاع ملی کہ داراشکوہ ملتان کے راستے سے بھکر کی طرف نکل گیا ہے۔ چنانچہ اس نے اپنے ایک امیر صف شکن خان کے ساتھ چھ ہزار سوار اس کے تعاقب میں بکھر روانہ کیے۔ داراشکوہ نے اُچ میں قیام کیا۔ جس وقت وہ اُچ میں قیام پذیر تھا، عالمگیر اور اس کے لشکری ملتان پہنچ گئے۔ اس کے امیروں میں شیخ میر اور دلبر خان نے نو ہزار لشکریوں کے ساتھ بکھر کی طرف حرکت کی۔ عالمگیر ملتان سے دہلی کی طرف واپس لوٹ گیا۔ عالمگیر کے دہلی واپس ہونے کے چند دنوں بعد داراشکوہ خشکی کے راستے سے بکھر پہنچ گیا۔

جس وقت داراشکوہ بھکر میں تھا تو بھکر سے ایک سو چھبیس میل دور صف شکن خان نے اپنے خیمے نصب کر دیے تھے۔ اسی دوران شیخ میر بھی اپنے لشکریوں کے ساتھ آ پہنچا۔ پھر شیخ میر اور صف شکن خان دونوں باہمی مشورے سے سیدھے اور بائیں راستے سے بھکر کی طرف روانہ ہوئے تاکہ داراشکوہ کو بچ نکلنے کا موقع نہ مل سکے۔ دارا کے لیے یہ صورت حال بڑی پریشان کن تھی۔ اس نے حوصلہ نہیں ہارا۔ اس سے پہلے کہ صف شکن خان اور شیخ میر کے لشکر اس کے فرار کا حلقہ تنگ کرتے وہ بکھر کے راستے سے جنوبی سندھ کی طرف نکل گیا۔

صف شکن خان 3 صفر المظفر سنہ 1079ھ کو بھکر پہنچ گیا۔ اُسے معلوم تھا کہ داراشکوہ کا تمام اثاثہ مال و اسباب، اہل و عیال اور سامان جنگ سید عبدالرزاق کی تحویل میں ہے اور اس کا ایک سفیر ملازم منوچی قلعہ بھکر میں موجود ہے۔ دارا نے جس وقت لاہور سے حرکت کی تھی تو اس کے ہمراہ دس ہزار لشکری تھے، لیکن ان کی تعداد کم ہوتے ہوتے تین ہزار رہ گئی تھی۔ داراشکوہ نے بھکر سے نکل کر پچاس میل کا فاصلہ طے کیا تھا اور چاہتا تھا کہ وہ زیریں سندھ میں جانے کے بجائے قندھار کا سفر اختیار کرے۔ لیکن اس کے سپاہیوں نے انکار کر دیا۔ خود اس کی بیوی نادرہ بیگم بھی قندھار کے سفر پر راضی نہ ہوئی۔ نتیجے میں داراشکوہ نے سیہون کا رُخ کیا۔ صف شکن خان نے روہڑی پہنچ کر شہر پر قبضہ کر لیا اور پھر قلعہ بھکر کی محاصرہ بندی کر دی۔ اس کے دوسرے روز 5 صفر سنہ 1069ھ کو اپنے لشکر کو لے کر داراشکوہ کے تعاقب میں سیہون پہنچ رہا ہے۔ اس نے اس کے پہنچنے سے پہلے سیہون سے نکل کر دریا عبور کیا اور ٹھٹھ کی راہ لی۔ صف شکن خان کو بڑی نا اُمیدی ہوئی۔ اس نے دریا کے بائیں کنارے بڑھنا شروع کیا۔ اسی دوران شیخ میر بھی اپنے لشکریوں کے ساتھ اس سے آملا۔

داراشکوہ اپنی بدنصیبی پر روتا ہوا، ایک بار پھر سندھ کی طرف واپس ہونے پر مجبور ہوا۔ اس وقت اس کے ساتھ اس کا بیٹا سپہر شکوہ، ایک ملازم فیروز منوچی اور ڈاکٹر برنیر تھے۔ جب عالمگیر نے داراشکوہ کے ایک بار پھر فرار ہونے کی خبر سنی تو جے سنگھ اور بہادر خان کو ایک لشکر کثیر کے ساتھ اس کے تعاقب میں روانہ کیا۔ داراشکوہ نے احمد آباد کے قریب پہنچ کر وہاں کے قلعہ میں پناہ حاصل کرنا چاہی، لیکن عالمگیر کا خوف اس قدر غالب ہو گیا تھا کہ کسی کو اس کی ہمت نہیں ہوئی کہ اسے پناہ دے۔ داراشکوہ نے ایک بار پھر دشت

کچھ کو عبور کیا اور بدین میں خیمے ڈالے۔ بدین میں اسے اطلاع ملی کہ ٹھٹھ کا صوبہ دار جو سپہر شکوہ کی نیابت کے فرائض انجام دے رہا تھا، باغی ہو کر اسے گرفتار کرانا چاہتا ہے۔ چنانچہ اس نے وقت ضائع کیے بغیر سیہون کی راہ لی اور چاہا کہ وہاں سے قندھار کی طرف نکل جائے، لیکن صورت حال یہ ہوئی کہ ہولار کا صوبہ دار خلیل خان اس کی گرفتاری کے لیے بھکر پہنچ گیا۔ اس موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے فیروز منوچی نے داراشکوہ سے غداری کی اور عالمگیری لشکر سے جا کر مل گیا۔ جے سنگھ رحمکی بازار پہنچ گیا۔ پھر نصر پور آیا۔ دارا شکوہ سیہون کے راستے سے دادو پہنچا۔ اس جگہ اس کی بیوی نادرہ بیگم نے شدید بیماری کے بعد وفات پائی۔ جے سنگھ نے داراشکوہ کے فرار کے راستوں کو مسدود کرنے کے لیے لاہور پہنچ کر خیمے لگائے۔ داراشکوہ نے اپنی بیوی نادرہ بیگم کی لاش خواجہ مقبول کے ذریعے سیہون سے لاہور بھجوائی کہ اسے میاں میر سندھ کے مقبرے میں دفن کر دیا جائے۔ ابھی داراشکوہ نے اپنی بیوی کی لاش لاہور بھجوائی تھی کہ ملک جیون خان جس نے اس کو پناہ دی تھی اس سے پہلے کہ وہ درۂ بولان سے نکل جاتا، مورخہ 29 رمضان سنہ 1069ھ کو اُسے گرفتار کر کے بہادر خان کے حوالے کر دیا۔ بہادر خان اسے لے کر دہلی روانہ ہوا۔ اس اثنا میں بھکر اور روہڑی میں داراشکوہ کی گرفتاری کی تشہیر کی گئی اور اُسے ایک بے سرو سامان قیدی کی حیثیت سے پھرایا گیا۔ اس کے بعد مختصراً الفاظ میں یوں کہا جاتا ہے کہ جس روز داراشکوہ کو دہلی لایا گیا، اسی روز رات کو عالمگیر کے حکم سے جبکہ داراشکوہ اپنے بیٹے سپہر شکوہ کے ساتھ قید خانے میں سو رہا تھا، داراشکوہ کو اس سے الگ کر کے قتل کر دیا گیا اور تجہیز و تکفین اور نماز وغیرہ کے بعد اس کی لاش ہمایوں کے مقبرہ میں دفن کر دی گئی۔

داراشکوہ کی حالت اس سفر سے غیر ہو گئی تھی۔ وہ راستوں کی تکلیف اور صعوبت سے پریشان ہو گیا تھا۔ اس کے باوجود صف شکن خان سے اس کا پیچھا چھوٹنا ممکن نہیں تھا۔ جب اس نے ٹھٹھ میں اپنے بچاؤ کی صورت نہیں دیکھی تو پورے شہر کو آگ لگا دی۔ تاکہ اس کو اس سے بھی نکل جانے میں کامیابی ہو۔ اس وقت قاضی امین الملک ٹھٹھوی اس کے مصاحب خاص تھے۔ انہوں نے مخزنِ اسرار کی شرح لکھی تھی، جس کو قبول عام حاصل ہوا تھا۔ اس کے علاوہ انہوں نے حضرت عبدالقادر جیلانی کی غنیۃ الطالبین کا عربی سے فارسی میں بھی ترجمہ کیا تھا اور اسے داراشکوہ کے نام معنون کیا تھا۔ صف شکن خان ٹھٹھ سے دو میل کے فاصلے پر منزل انداز ہوا۔ شیخ میر بھی اپنے لشکریوں کے ساتھ پہنچ گیا۔ صف شکن خان نے دریا عبور کر کے صورت حال کا جائزہ لیا، لیکن اس کو یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ داراشکوہ کدھر گیا ہے اور کس راستے سے گیا ہے۔ داراشکوہ نے بدین پہنچ کر یہ طے کرتے ہوئے گجرات کی راہ لی۔

اسی دوران صف شکن خان کو عالمگیر کا حکم ملا کہ وہ شاہزادۂ شجاع کی بغاوت کو فروغ کرنے کے لیے اپنے تمام لشکریوں کے ساتھ واپس دہلی آئے۔ وہ ابھی واپس ہونے کی تیاری کر رہا تھا کہ داراشکوہ کاٹھیاواڑ پہنچا۔ پھر قلعہ احمد آباد میں قیام کیا۔

داراشکوہ نے ایک مہینہ سات دن تک قلعہ احمد آباد میں قیام کیا۔ اس زمانے میں قلعہ احمد آباد سے شاہزادہ مراد بخت کے رکھے ہوئے دس لاکھ روپے اس کے ہاتھ آئے۔ اس نے ان روپوں کو لشکر کی تیاری پر صرف کیا اور بیس ہزار سے زیادہ سپاہی بھرتی کیے اور پھر احمد آباد سے اجمیر کی طرف بڑھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اجمیر سے آگرہ پہنچ کر شاہ جہان کو عالمگیر کی قید و بند سے نجات دلائے۔ عالمگیر نے اس کے ارادے کو بھانپ کر دیورائے کے قریب مقابلے کی تیاری کی اور اجمیر سے چار میل دور میدانِ جنگ تیار ہو گیا۔ اگرچہ داراشکوہ نے مقابلہ کی پوری تیار کر رکھی تھی، لیکن اس کا ہر کام اُلٹا ہو رہا تھا۔ چنانچہ اس جنگ میں بھی اسے 29 جمادی الاول سنہ 1029ھ کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ اس جنگ میں اگرچہ داراشکوہ کا تمام لشکر تباہ ہو گیا لیکن عالمگیری سپہ سالار شیخ میر اور اس کے ساتھی بھی ہلاک ہو گئے اور احمد آباد کے عالم شاہنواز خان نے جو عالمگیر کا خسر تھا۔ پس پردہ داراشکوہ کو مدد پہنچانے کی کوشش کی۔ اس کو بھی اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑا۔ ان دونوں کی لاشیں خواجہ معین الدین چشتی کی خانقاہ کے احاطے میں دفن کر دی گئیں۔

داراشکوہ، شاہ جہان کے بیٹوں میں اس اعتبار سے زیادہ اہم شخصیت کا مالک تھا کہ اسے نہ صرف صوفیوں، عالموں اور مشائخوں سے عقیدت تھی، بلکہ علم و عرفان اور سلوک و ریاضت کے مختلف مرحلوں کو خود بھی سمجھتا تھا۔ اس کی ایام شہزادگی کی تصانیف میں سفینۃ الاولیاء صوفیا کے حالات کے سلسلے میں مستند تذکرہ خیال کیا جاتا ہے۔ جبکہ میاں میر اور ان کے خلفا کے حالات سکینۃ الاولیاء کو معاصرانہ درجہ حاصل ہے۔ اس کے علاوہ ان کا دیوان بھی شائع ہو چکا ہے جس میں انہوں نے اپنا تخلص ''قادری'' کیا ہے۔ اس کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کی تعلیم و تربیت کس نہج پر ہوئی تھی اور وہ شعر گوئی میں کس درجہ مقام رکھتا تھا۔ بعض مورخوں کے بیان کے مطابق مختلف عالموں اور صوفیا کے نام اس کے لکھے ہوئے خطوط بھی ملتے ہیں، جن سے اس کے معتقدات پر روشنی پڑتی ہے۔

❀❀❀

CS CamScanner

میں وہ ''بوٹا'' نہیں

ایم بوٹا انجم/ملائیشیا

پنجاب کے دیہات کا یہ کلچر رہا ہے کہ گاؤں کے قریباً ہر شخص کا اصل نام مختصر کرنے کے چکر میں بگاڑ دیا جاتا ہے۔ مثلاً نام محمد رفیق ہے تو فیقا، عبدالرشید ہے تو شیدا، سردار علی ہے تو دارا، شمیم اختر ہے تو شیمو اور رضیہ ہے تو رجو وغیرہ وغیرہ۔

میرے بچپن کا واقعہ ہے کہ ہمارے گاؤں میں جان بی بی نام کی ایک مڈ برسی خاتون تھی جو جانو کے مختصر نام سے جانی اور پکاری جاتی تھی۔ اُنہی دنوں لاہور کے ایک فلمساز کو نہ جانے کیا سوجھی کہ ایک لڑاکا طبع اور پھڈّے باز قسم کی خاتون کے مرکزی کردار پر مبنی ایک پنجابی فلم بنا ڈالی، اور نام اُس کا رکھ دیا'' جانو کپتی'' یعنی ہر گھڑی فساد برپا کرنے پر تیار پھڈّے باز عورت۔

ٹی وی کی نشریات تب تک پاکستان میں شروع نہیں ہوئی تھیں اور مُلکی سطح پر فلم کی مشہوری یعنی ایڈورٹائزنگ کا واحد ذریعہ ریڈیو پاکستان ہوا کرتا تھا۔ چنانچہ مذکورہ فلم کے ریڈیو اشتہار پر مبنی صداکاری جس فقرے پر ختم ہوتی، وہ تھا'' اج ای ویکھو محفل سینما وِچ جانو کپتی''۔ (آج ہی دیکھیں محفل سینما میں جانو کپتی) اور یہ ایڈ (Ad) دِن کی نشریات کے دوران درجنوں بار دہرائی جاتی۔ اِس سے بچوں کے ہاتھ ایک شرارت لگ گئی۔ اُن میں سے کوئی ایک جان بی بی کے گھر کے سامنے جا کر گلا پھاڑ کر آواز لگاتا'' اج ای ویکھو محفل سینما وِچ جانو کپتی''۔ اور جان بی بی برہم ہو کر اندر سے اُسے گالیاں دیتی ہوئی جب تک باہر آتی تب تک بچہ بھاگ گیا ہوتا۔ پھر یوں ہوا کہ جان بی بی اکثر ڈنڈا ہاتھ میں تھام کر دروازے کے پاس چھپ کر کھڑی رہتی اور جیسے ہی کوئی بچہ واردات کے لیے پہنچتا وہ ڈنڈے سے اُسے مارنے کے لیے دوڑتی مگر بچے پکڑائی کہاں دیتے تھے۔ بات اِتنی بڑھی کہ اُس نے گھر میں پتھر جمع کر لیے اور وارداتی بچوں کو اُن سے نشانہ بنانے لگ گئی۔ خطرہ پیدا ہو گیا کہ اگر یہ سلسلہ مزید کچھ دِن جاری رہا تو وہ پاگل ہو جائے گی یا کوئی بچہ اُس کے ہاتھوں زخمی ہو جائے گا۔ چنانچہ گاؤں کے نمبردار نے اِس واقعہ کا سوؤ موٹو نوٹس لیتے ہوئے تین چار وارداتی بچوں کی سرِ عام چھترول کی (میں اُن میں شامل نہیں تھا)۔ اور یوں اُس عجیب طرح کی شرارت کا خاتمہ بالخیر ہو گیا۔

قارئین کرام! نصف صدی پہلے کا یہ قصہء پارینہ بطورِ تمہید مجھے یوں یاد آیا کہ کچھ عرصہ پہلے سوشل میڈیا پر پنجابی زبان کا یہ فقرہ وائرل ہو گیا یعنی خاصا چل نکلا کہ'' فیر کہندے اے بُوٹا گالاں کڈدا''۔ (پھر کہتے ہیں کہ بُوٹا گالیاں دیتا ہے)۔ جو نہیں جانتے وہ جان لیں کہ میرا نام محمد بُوٹا ہے اور انجم کا دُم چھلا میں نے تخلّص کے طور پر ساتھ لگا رکھا ہے۔ ریسرچ کرنے پر پتا چلا ہے کہ یہ فقرہ ایک پنجابی فلم کا ڈائیلاگ ہے۔ کوئی مانے نہ مانے مگر مجھے یقین ہے کہ یہ'' جانو کپتی'' قسم کی واردات ہے۔ آخر گالیاں دینے کے حوالے سے اِس فقرے کے خالق کو میرا نام ہی کیوں سُوجھا۔ وہ بُوٹا کی جگہ بشیرا، شیدا، شکورا یا فیقا بھی تو لکھ سکتا تھا۔ مجھے لگتا ہے کہ میرے کسی ہم نام نے اُس فلم کے کہانی نویس کے ساتھ کوئی زیادتی کی ہو گی جو اُس نے بوٹے کی چھیڑ کے طور پر انتقاماً یہ فقرہ زباں زدِ خاص و عام کر دیا ہے۔

شکر ہے کہ میں کوالا لمپور کے ایک تیس منزلہ رہائشی پلازے کے پندرھویں فلور پر قیام پذیر ہوں جہاں میرے اِرد گرد پاکستانی فیملیز نہیں ہیں ورنہ اُن کے بچے بھی میرے دروازے کے سامنے یہ ڈائیلاگ با آواز بلند بولنے آ جاتے کہ'' فیر کہندے اے بُوٹا گالاں کڈدا'' اور مجھے اپنے گاؤں کی جان بی بی کی طرح ڈنڈے اور پتھروں کا استعمال کرنا پڑتا۔ تاہم جانو کپتی جیسے واقعے کا ہلکا پھلکا ٹریلر یہاں یوں چلنا شروع ہو گیا ہے کہ رہائشی ایریا یا کاروباری مرکز میں جب بھی کوئی فری فرینک قسم کا دوست مِلتا ہے وہ دُعا سلام کے ساتھ ہی ہنستے ہوئے کہتا ہے'' جناب! ایہہ دسو کہ بُوٹا گالاں کیوں کڈدا اے؟'' (جناب یہ بتائیں کہ بوٹا گالیاں کیوں دیتا ہے) اور جواباً میں صرف ہنس دیتا ہوں کیونکہ اگر میں اُس کی بات کو مائنڈ کروں گا تو بات بڑھے گی اور میرا حال بھی جان بی بی جیسا ہو سکتا ہے۔ بہرحال آپ سب کی اِطلاع کے لیے عرض ہے کہ بحیثیت سینئر سٹیزن میں ایک بزرگ آدمی ہوں اور یہ عُمر میرے اللہ توبہ کرنے کی ہے، کسی کو گالیاں دینے کی نہیں۔ چنانچہ وضاحت کے طور پر گزارش ہے کہ میرا کوئی اور ہم نام ہو تو ہو لیکن میں وہ بُوٹا نہیں ہوں جو'' گالاں کڈدا اے''۔ اِس لیے یہ فقرہ پڑھ یا سُن کر کسی کا دھیان میری جانب بالکل نہیں جانا چاہیے۔ آپ کی بڑی مہربانی۔

تو ہی ناداں۔۔

1969 کا واقعہ ہے۔ میں ایک پرائیویٹ اُمیدوار کے طور پر بی اے کا امتحان دے کر فارغ ہوا تو شدید مالی مُشکلات کا شکار تھا۔ رزلٹ کے انتظار میں تین چار ماہ فارغ بیٹھنے کی بجائے میں نے مُلتان سے یزمان منڈی تک چلنے والی ایک بس پر کنڈکٹری کر لی۔ انتہائی مشقت طلب کام ہفتے کے ساتوں دِن کرنا پڑتا تھا اور دِن رات میں قریباً 14 گھنٹے کی ڈیوٹی تھی۔ ایک روز میرے والی بس خراب ہو کر ورکشاپ پہنچ گئی تو چھٹی جیسی انمول نعمت سے اِستفادہ کرنے

کے لیے میں ممتاز آباد کالونی سے پیدل مارچ کرتا ہوا قلعہ کہنہ قاسم باغ جا پہنچا۔

اُس جگہ کے ساتھ میری بہت سی خوشگوار یادیں وابستہ تھیں۔ تقریباً ڈیڑھ برس قبل جب میں ولایت حُسین اسلامیہ ڈگری کالج میں تھرڈ ایئر کا سٹوڈنٹ تھا تو اُس جگہ شاہ بہاؤالحق ذکریا کے مزار کے قریب واقع ہندوؤں کے ایک بوسیدہ سے مندر میں میری رہائش ہوا کرتی تھی کیونکہ تب وہ مندر مذکورہ کالج کے ہاسٹل کے طور پر زیرِ استعمال تھا۔ وہاں بہت سے کالج فیلو دوستوں کی سنگت میسّر تھی جو ایک نعمتِ خُداوندی سے کم نہیں ہوتی۔ علاوہ ازیں اکثر میں شام کو میچ دیکھنے قلعہ پر واقع فٹ بال گراؤنڈ کا رُخ کر لیا کرتا تھا پھر ذہنی سکون کے لیے بہاؤالحق ذکریا اور شاہ رُکنِ عالم نُوری کے مزارات کے اندر کچھ وقت گزارنے چلا جاتا تھا۔ 1968 میں والد صاحب کی بے وقت رحلت کے باعث میں کالج کو خیر باد کہہ کر محنت مزدوری کرنے اور ٹیوشنز پڑھانے پر مجبور تھا تاکہ کچھ کما کر اپنا اور اپنی ماں کا پیٹ پال سکوں۔ تاہم حصولِ تعلیم کے سلسلے کو جاری و ساری رکھتے ہوئے میں نے اگلے ہی برس ایک پرائیویٹ اُمیدوار کے طور پر بی اے کا امتحان دے دیا تھا۔

کنڈکٹری سے چھٹی والے دِن قلعہ کہنہ قاسم باغ کی جانب جاتے ہوئے میں نے اُس روز کا اُردو اخبار ''امروز'' خرید لیا۔ وہاں اخبار بینی کے دوران یہ دلچسپ خبر نظر نواز ہوئی کہ مُلتان سے ایک انکم ٹیکس افسر کی رحیم یار خاں ٹرانسفر ہوئی تو صاحب نے اپنی فیملی کو گھریلو سامان سمیت پوسٹنگ کی نئی جگہ پر شفٹ کرنے کے لیے باقاعدہ ایک جہاز چارٹر کروایا۔ اُس سے انکم ٹیکس افسر کی شان و شوکت اور مالی خوشحالی کا اندازہ بخوبی کیا جا سکتا تھا۔ اُس اخباری خبر سے دِل میں یہ خواہش جاگی کہ کاش میں بھی کبھی انکم ٹیکس افسر بن سکوں۔ کچھ دیر بعد قریب ہی واقع شاہ رُکنِ عالم نُوری کے مزار کے اندر چلا گیا۔ اُس بزرگ کی قبر پر فاتحہ خوانی کی اور دو رکعت نفل ادا کر کے دُعا کے لیے ہاتھ اُٹھائے تو خاموشی کی زبان میں ربِ دو جہاں سے مخاطب ہو کر کہا کہ اے رازق و مالک! تیرے خزانوں میں کیا کمی ہے۔ کسی گدا کو شاہ بنانا تیرے لیے کون سا مُشکل کام ہے۔ تو چاہے تو اِس مفلوک الحال بندے کے دِن پھیرتے ہوئے اِسے بھی انکم ٹیکس افسر بنا سکتا ہے۔

وقت دبے پاؤں گزرتا رہا اور میں تسلسل کے ساتھ جدوجہد کرتا ہوا شاہراہ حیات پر آگے بڑھتا رہا۔ نو برس بعد میں نے سی ایس ایس کا امتحان دیا تو 1979 کے بیچ (Batch) میں پاکستان بھر میں میری اٹھارہویں پوزیشن آئی جس کے مُطابق میں پولیس سروس آف پاکستان کے لیے کوالیفائی کرتا تھا۔ تاہم اکیڈمی ٹریننگ کے بعد جب محکموں کی الاٹمنٹ ہوئی تو غیر متوقع طور پر مجھے انکم ٹیکس گروپ الاٹ کر دیا گیا۔ یہ امر میرے لیے افسوسناک تھا کیونکہ پولیس گروپ انکم ٹیکس گروپ سے بہتر سمجھا جاتا تھا اور میں نے اپنے چوائسز میں بھی اُسے انکم ٹیکس پر ترجیح دے رکھی تھی۔ بہر حال انکم ٹیکس سروس بھی میری اوقات سے کہیں زیادہ تھی کیونکہ کل تک بس کنڈکٹری کرتے ہوئے ایک مزدور کو حکومتِ پاکستان کی اعلیٰ ترین ملازمتوں میں سے ایک کا حقدار بنا دیا گیا تھا۔۔۔ اور پھر ایک روز مجھے یونہی خیال آیا کہ 1969 میں شاہ رُکنِ عالم نُوری کے مزار پر میں نے دُعا میں اپنے اللّٰہ سے انکم ٹیکس افسری کی اِلتجا ہی تو کی تھی۔ یقیناً وہ لمحہ قبولیت کا تھا اور وہ دُعا حرف بہ حرف پوری ہو گئی۔ ساتھ ہی علامہ اقبال کا یہ شعر بھی سطحِ ذہن پر اُبھرا کہ:۔

تُو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا
ورنہ گلشن میں علاجِ تنگیٔ داماں بھی تھا

اور کاروباری حضرات کا یہ فقرہ بھی یاد آیا کہ گاہک اور خُدا سے ہمیشہ کُھل کے مانگو۔

1995-96 میں جب میں بطور فرسٹ سیکرٹری فیڈرل بورڈ آف ریونیو، اسلام آباد میں تعینات تھا تو میں نے یہ واقعہ اپنے رفیقِ کار اور فیملی فرینڈ خاور احمد کو سُنایا تو اُس نے بتایا کہ وہ انکم ٹیکس افسر جو کہ 1969 میں مُلتان سے رحیم یار خاں ٹرانسفر ہوا تھا اِن دنوں راولپنڈی میں تعینات ہے۔ چنانچہ پرویز اختر نامی اُس افسر کو میں بطورِ خاص ملنے گیا تو اُس نے وہ واقعہ یوں سُنایا۔

''انجم صاحب! یہ پرنٹ میڈیا والے۔۔۔ بڑھا بھی دیتے ہیں کچھ زیبِ داستاں کے لیے۔۔۔ اصل میں ہُوا یہ تھا کہ میں زمانہء طالبعلمی ہی سے مُلتان فلائنگ کلب کا ممبر تھا۔ اور سروس میں آنے کے بعد بھی میں نے اپنے ہوابازی کے شوق کی آبیاری جاری رکھی۔ چنانچہ جب میری مُلتان سے رحیم یار خاں ٹرانسفر ہوئی تو جس روز میں نے وہاں جوائن کرنا تھا اُس دن میرا ایک ہواباز ساتھی مجھے کلب کے ایک چھوٹے سے جہاز پر رحیم یار خاں ڈراپ کر آیا تھا۔۔ اخبار والوں نے بات کا بتنگڑ بناتے ہوئے اُس تربیتی جہاز کو چارٹرڈ طیارہ قرار دے کر لکھ دیا کہ میں فیملی کے ساتھ اپنے گھریلو سامان سمیت اُس میں رحیم یار خاں شفٹ ہوا تھا۔''

اِس پر میں نے تفننِ طبع کے طور پر کہا کہ سر! میرے ساتھ زیادتی گویا آپ نے نہیں بلکہ اخبار والوں نے کی تھی کیونکہ اُس روز مبالغہ آمیزی پر مبنی وہ خبر پڑھ کر شاہ رُکنِ عالم نُوری کے مزار پر اگر انکم ٹیکس افسر بننے کی دُعا نہ مانگتا تو آج میں ایک پولیس افسر ہوتا۔۔۔ یا شاید کچھ بھی نہ ہوتا۔

میرے عہد کا قاسمی: میرا واحد سراج

ڈاکٹر عادل سعید قریشی/ایبٹ آباد

میں نے لوگوں پہ وا ردی ساری
زندگی تھی ہی وارنے کے لیے

عبدالواحد میر، قلمی نام واحد سراج، ایبٹ آباد کے دس معززین اور باثر افراد کی فہرست بنایئے تو واحد سراج ان میں نمایاں دکھائی دیں گے۔ یہی ان کا تعارف ہے۔ ان کے تعارف کے کئی حوالے اور بھی ہیں، جن میں اولین مدرس ہونا ہے۔ اس کے علاوہ ماہر تعلیم، نصاب ساز، ماسٹر ٹریز، دانش ور، انشا پرداز، سوشل ورکر، سماجی رہنما، انسان دوست شخصیت ہیں۔ اردو ادب کے میدان میں وہ شاعر ونقاد کے طور پر بھی جانے جاتے ہیں۔ بزم علم وفن (ہزارہ شاخ) کے صدر ہی نہیں، اس بزم کے روح رواں بھی آپ ہی ہیں۔ واحد سراج کی ادب پروری اور ادیب نوازی پر اپنے پرائے سبھی متفق ہیں۔ واحد سراج کی ایک خوبی کہ جس کا بیان یہاں برمحل ہوگا وہ یہ ہے کہ آپ ادب کی دنیا میں فعال ہونے کے باوجود ایک غیر متنازعہ شخصیت ہیں۔ ہر مکتبہ فکر اور تمام مسالک کے زعما آپ سے یکساں محبت کرتے ہیں اور یہ محبت واحد سراج نے اپنی خوش اطواری، ملنساری، بردباری اور برداشت سے کمائی ہے۔ ان کی طبیعت میں دھیماپن اور ظرف اس قدر ہے کہ سامنے والے کا آپ کو خفا کرنا یا آپ کو زچ کرنا چاہے بھی تو منہ کی کھائے گا۔ وہ احباب جن کو واحد سراج کی صحبت کا اعزاز حاصل ہے، وہ جانتے ہیں کہ واحد سراج ایک باظرف دوست، یار باش اور وسیع دسترخوان رکھنے والا انسان ہی نہیں بلکہ ایک باشعور فرد ہیں کہ جن کی حس مزاح اور فطانت کا مقابلہ کرنا ہر کسی کے بس کا کام نہیں۔ واحد سراج شخصی غیرت وحمیت کا پتلا، مشرقی وضع داری کا پیکر، دوسروں کی رائے کا احترام کرنے والے، اجتماعی سوچ کے حامل پاکستانی، دوسرے کی عزت نفس کی ضمانت دینے والے آدمی ہیں گویا میرا واحد سراج ہی میرے عہد کا قاسمی ہے۔ احمد ندیم قاسمی، ایک ادارے کا نام تھا۔ وہ محبت کرنے والے، حساس دل، معتدل، عمیق نظر، ادیب پرور، زمانہ شناس اور منجھے ہوئے فن کار تھے۔ وہ گفت گو کے دھنی اور خوش گفتاری کی مثال تھے، تو واحد سراج میں بھی یہ ساری خوبیاں موجود ہیں۔ واحد سراج کا دل اور ہاتھ اس قدر کشادہ ہیں کہ یار لوگ ان سے منسوب باتوں کو افواہ جانتے ہیں لیکن وہ خوب جانتے ہیں جن کو ان سے راہ ورسم رہی۔

''روشنی ایک حادثہ ہے'' واحد سراج کا پہلا شعری مجموعہ ہے جو جنوری 2024ء میں شائع ہوا۔ اس کے کل صفحات 140 ہے اس کا انتساب انہوں نے اپنے ''ابا جی، امی جی، سومی، زون، مونا، ایڈی'' کے نام کیا۔ اس شعری مجموعے ''روشنی ایک حادثہ ہے'' کا بیک فلیپ سینئر بیوروکریٹ، شاعر اور کالم نگار محمد اظہار الحق نے تحریر کیا ہے۔ اندرونی فلیپ اولیٰ منجھے ہوئے شاعر احمد حسین مجاہد نے لکھا اور اندرونی فلیپ ثانی ہزارہ کے معروف اردو، ہندکو کے شاعر امتیاز الحق امتیاز نے لکھا ہے۔ کتاب کی قیمت ۶۰۰ روپے ہے۔ شاعری، جیسا کہ ہمیں معلوم ہے کہ ایک الہامی چیز ہے اور اس کا رشتہ ہمیشہ سے انسان کے ساتھ دو رویہ رہا ہے، یعنی ایک انسانی قلب و ذہن سے ہے اور دوسرا تخلیق کار کے ماحول سے، اس کی ثقافت اور سماج سے، ازل سے انسان اور شعر کی ناتے داری ہے۔ یہ بھی ہے کہ شاعری کی نوعیت الوہی ہے اور واحد سراج کی کتاب ''روشنی ایک حادثہ ہے'' اسی الوہیت کی دستاویز ہے۔

شعری مجموعہ ''روشنی ایک حادثہ ہے'' میں کم و بیش 36 غزلیں، 35 نظمیں اور دو قطعے شامل ہیں۔ غزل کہ جسے اردو شاعری کی ساری اصناف کا تاج مانا جاتا ہے، اس مجموعے میں بھی غزل کا پلڑا بھاری دکھائی دیتا ہے۔ واحد سراج کی غزل اسی اردو کلاسیکی غزل کا تازہ نمونہ ہے جس کلاسیکی روایت کا اصل منبع فارسی غزل ہے۔ برصغیر پاک و ہند میں ولی دکنی کی غزل کو اردو غزل کا امام قرار دیا جاتا ہے، واحد سراج کی غزل بھی اسی اردو غزلیہ روایت کا تسلسل ہے۔ واحد سراج کی غزل میں رمز وایمائیت، بالیدہ اور شستہ بیانی، موضوعات کا تنوع، خیال کی پختگی، مشاہدے کی گہرائی، تجربے کی گہرائی اور غزلیہ ڈکشن اپنے قاری سے دادخواہ ہے۔ واحد سراج کی غزل اپنے مضامین کی تازگی، عصری شعور، تہذیبی سوجھ بوجھ، شاعر کی اپنی ذہانت اور فطانت کے ساتھ ساتھ ان کی سوچ کا انفراد اور اور پیشکش کی متانت جیسی خوبیوں سے متصف ہے۔ یہی اوصاف حسنہ واحد سراج کو اپنے معاصرین غزل گویان میں ممتاز کرتے ہیں۔

شجر شجر تھیں مچانیں، قدم قدم گھاتیں
سبکتگیں سا یہ مرا مزاج کیا کرتا
وفورِ بے خبری میں کبھی سنا ہی نہیں
جو حریت کا مکمل سبق آذان میں ہے
محبت ہے خبارہ ہی خسارہ
تمہاری مات بھی ہے مات اپنی
آگیا یاد گریباں اس دم
ہاتھ اک آن جو سینہ بھولے
یار لوگوں سے ملے زخموں کا مرہم مانگیں
ہم بھلا کیسے یہ تذلیل رفاقت کر جائیں

بے سمت مسافت تھی کسی کام نہ آئی
اک صبح جو بھولا تو مجھے شام نہ آئی
اک رستہ کہیں تھا میں جسے ڈھونڈ نہ پایا
اک چٹھی کہیں تھی جو مرے نام نہ آئی

''روشنی ایک حادثہ ہے'' کا ایک حصہ نظم پر مشتمل ہے، 36 نظمیں لکھی گئی ہیں۔ نظم کی تاریخ اردو زبان و ادب میں قریباً 200 سال پرانی ہے، خواجہ الطاف حسین حالی سے شروع ہونے والا یہ نظم کا سفر نظیر اکبر آبادی سے ہوتا ہوا، اقبال اور جوش، فیض اور پھر مجید امجد تک پہنچتا ہے، واحد سراج بھی اسی سلسلے کی کڑی ہیں۔ اردو نظمیہ روایت میں اور بھی بہت سارے نام لیے جا سکتے ہیں لیکن موضوع چونکہ واحد سراج کی نظم ہے اس لیے اپنے موضوع کی طرف گریز کرتا ہوں کہ واحد سراج کی نظم کا کینوس معنوی اور ہیئتی اعتبار سے بڑا ہے۔ یہ کینوس اپنا حسن اپنے موضوع کے اعتبار سے دکھاتا جاتا ہے۔ یہ بات تو مسلمہ ہے کہ نظم کا کینوس ویسے بھی تخلیق کار کو اس کی فکر اور رفعت خیال کے مطابق میسر آتا ہے لہٰذا ایک تخلیق کار جو خیال، جو بات نظم کی صورت میں بیان کرنے کی سعی کرتا ہے اس کو غزل کی نسبت قدرے سہولت حاصل رہتی ہے، اور پھر واحد سراج کی طرح اگر شاعر کے پاس خیال کی پختگی اور بیان کے قرینے اور برت کے سلیقے ہوں تو نظم کا روپ سروپ خود اپنے جلوے دکھائے جاتا ہے۔ جیسے اس شعری مجموعے میں شامل احتمال، شاہ مدار، اندھیری ٹھنڈک، کانٹا، بے ثمر معجزہ، ہارتی سپہ کا سالار، سامری، بارسنگ جیسی نظمیں اپنے قاری کو خوش گوار مطالعے کا موقعہ باہم پہنچاتی ہیں۔ واحد سراج کی نظم گوئی ان کے سوچ و فکر کے انفراد، وسیع مطالعے، معاشرتی شعور اور وقیع تجربے پر دال ہے۔

یہ کتاب ''روشنی ایک حادثہ ہے'' جو کہ غزل و نظموں کا مجموعہ ہے اس کا سرسری مطالعہ بھی ہمیں یہ بتاتا ہے کہ واحد سراج کے پاس نہ موضوعات کی کمی ہے نہ بیان کے قرینوں کی، شعری خوش سلیقگی کا جو عکس اس مجموعے میں دکھائی دیتا ہے وہ بہت کم شعرا کو نصیب ہوا ہے۔ اس کتاب کا ہر ہر مصرعہ اپنے تخلیق کار کی محنت، کڑے انتخاب اور بالیدہ فکری کا نمونہ ہے۔ اس کتاب کا بالاستعیاب مطالعہ اس حقیقت کو افشا کرتا ہے کہ شاعر جس موضوع کو جس طریقے کے ساتھ بھی برتنا چاہتا ہے، وہ بہ سہولت برت لیتا ہے۔ اس کو لفظیات کی تلاش میں خجل ہونا پڑتا ہے نہ ہی اس کو تراکیب سازی کے لیے محنت شاقہ کرنا پڑتی ہے۔ لفظیات کا جہاں تک تعلق ہے تو اردو کے بعد فارسی اور ہندی لفظیات ان کے ہاں بہت خوبصورتی سے استعمال ہوئے ہیں۔ شعری مجموعہ خود گواہی دے رہا ہے کہ میرے شاعر کی لفظیات کا ذخیرہ بہت معتبر ہے۔ قاری خود دیکھتا ہے کہ شاعر کے سامنے الفاظ ہاتھ باندھے قطار در قطار کھڑے ہیں۔ شاعر جس لفظ کو جس طرح چاہتا ہے باندھتا جاتا ہے۔ مجموعے میں الفاظ کا دروبست میرے اس دعویٰ کا ثبوت ہے۔

شاعری کہ جس کو گانے کی شے تصور کیا جاتا ہے اس اعتبار سے بھی ''روشنی ایک حادثہ ہے'' کی غزلوں اور نظموں میں ایک لے اور ترنم بدرجہ اتم ملتا ہے۔ واحد سراج کے شاعری اردو زبان و ادب کے اس شعری روایت کی امین ہے جس میں عصری شعور، فکر و خیال کی پختگی، بلاغت فصاحت کی برت اور اس کے ساتھ ساتھ واحد سراج کا اپنا نظریہ حیات بھی ہمیں وہاں سے ملتا ہے:

اسی طرح سماجی موضوعات کی نزاکت کو جس طریقے کے ساتھ وہ برتتے ہیں اور پھر اس موضوعیت کو جس طرح وہ معروضیت میں ڈھالتے ہیں، وہ کچھ انھی کا اختصاص ہے۔ ہاں البتہ ان کا قاری داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ واحد سراج کے ہاں شاعری اپنے تخلیق کار کے صاحب مطالعہ شاعر ہونے کا پتا دیتی تلمیحات کا متین استعمال اور تجربے کی دقت اور مشاہدہ کی سنجیدگی اپنی مثال آپ ہے۔ ان سب کا حسین امتزاج اس کتاب کا وصف خاص ہے۔ ''روشنی ایک حادثہ ہے'' اردو شعری ادب میں ایک گراں قدر اضافہ تصور ہوگی۔

مالک الملک جو چاہے تو میسر کر دے
ایسا اک لفظ کہ مفہوم کو ششدر کر دے
سنگ خاموش میں گر رکھنا ہے معنی خفتہ
میرے الفاظ کو پھر تیشہ آذر کر دے

واحد سراج کی ادبی خدمات کی نوعیت قدرے الگ سہی لیکن جس طرح وہ ادبا و شعرا کو اپنے حلقہ میں لے کر چل رہے ہیں، بزم علم و فن کے پلیٹ فارم کے علاوہ بھی دیگر ادبی تنظیموں کی اعانت اور سرپرستی کرتے ہیں، وہ کچھ انھی کا خاصہ ہے۔ کئی ادیبوں کی کتابوں کی اشاعت کا انتظام بھی انھوں نے کیا ہے۔ اردو زبان و ادب کے ساتھ ساتھ ہندکو زبان و ادب کی پرداخت میں آپ اپنا کردار ادا کر رہے ہیں۔ آپ اپنا مسئلہ خواہ اس کی نوعیت کوئی بھی ہو ان کے پاس لے کر جائیے پھر دیکھیے کیسے وہ اس مسئلہ کو حل کر کے آپ کو رخصت کرتے ہیں۔ مجھے ان کو دیکھ اور سوچ کر ایسا ہی لگتا ہے جیسے قاسمی صاحب کا دور تھا کہ اپنا افسانہ لکھ بھیجیے پھر ہفتے کے اندر اندر اصلاح شدہ افسانہ لوٹ آئے گا۔ غزل بھیجیے تو رسیدی خط نہ آئے یہ ممکن نہیں۔ میرے نزدیک ادیب پروری اور شاعر دوستی کا کوئی معیار ہے تو وہ قاسمی صاحب تھا اور میرے عہد کا قاسمی، میرا واحد سراج ہے۔ کیوں کہ وہ کہتے ہیں:

ہم نے اک پھول کو گلشن میں مقدم رکھا
ہم نے اک تارہ سماوات سے بڑھ کر چاہا
پاؤں پھیلائے تو پھر دیکھی نہ چادر ہم نے
جب تجھے چاہا تو اوقات سے بڑھ کر چاہا

بیسویں صدی میں اُردو غزل کے عمومی رجحانات

لبنیٰ صفدر

ان تحریکوں نے غزل کے عمومی رجحانات میں بڑے پیمانے پر اثرات مرتب کیے۔ حلقہ اربابِ ذوق کی تحریک قیامِ پاکستان کے بعد سے لے کر ابھی تک باقاعدگی سے اپنے اجلاس کرا رہی ہے اور اپنے منشور پر عمل پیرا ہے۔ ترقی پسند تحریک چاہے جتنی بھی مخدوش ہوگئی اُس کی باقیات بھی کسی نہ کسی شکل میں موجود ہیں۔

ترقی پسند شعراء کے ہاں یہ بات قابلِ نظر ہے کہ ان کے ہاں قیامِ پاکستان کے بعد وہ اپنے آدرشی سماج کی فکری اور عملی تشکیل کے لیے متحرک تھے اور یہ تحریک مقتدر طبقات کے مفادات کے حق میں نہ تھی۔ اس لیے وہ حکومتی ظلم وستم کا نشانہ بنے۔ یہ ساری صورت حال اس دور کی غزل میں نظر آتی ہے۔

اس میں سب سے زیادہ مضبوط اور توانا آواز فیض احمد فیض کی ہے۔

جو رُکے تو کوہِ گراں تھے ہم جو چلے تو جاں سے گزر گئے
رہِ یار ہم نے قدم قدم تجھے یادگار بنا دیا
(فیض)

بیسویں صدی میں عظمتِ انسان اور فطرت کے بیان کے حوالے سے احمد ندیم قاسمی کا نام نہایت معتبر ہے۔ انہوں نے اپنے رسالے فنون کے ذریعے اُردو غزل کی بڑی خدمت کی اور بڑے بڑے نامور شعرا سامنے آئے۔ احمد ندیم قاسمی ایک عہد ساز ادیب تھے۔

اے خدا پھر یہ جہنم کا تماشا کیا ہے
تیرا شاہکار تو فی النار نہیں ہو سکتا
(احمد ندیم قاسمی)

کون کہتا ہے کہ موت آئی تو مر جاؤں گا
میں تو دریا ہوں سمندر میں اُتر جاؤں گا
(احمد ندیم قاسمی)

انجم رومانی کی غزل مشاہدات و تجربات پر مبنی ہے۔ طنزیہ لہجہ ان کے ہاں نمایاں ہے۔ ان کی غزل میں یکسانیت نہیں تنوع ہے۔ وہ مشاہدات کے نہیں تجربات وشواہد کے شاعر ہیں۔

کچھ اجنبی سے لوگ تھے کچھ اجنبی سے ہم
دنیا میں ہو نہ پائے شناسا کسی سے ہم

صوفی تبسم اور عابد علی عابد کے ہاں فارسی زبان و ادب کا گہرا شعور موجود ہے۔ ان کی غزل میں فارسی لب ولہجہ کی شیرینی اور مٹھاس موجود ہے۔

چپکے چپکے رات دن آنسو بہانا یاد ہے
ہم کو اب تک عاشقی کا وہ زمانہ یاد ہے
(صوفی تبسم)

عبدالحمید عدم کی غزل میں رجائیت فلسفیانہ طنز اُمیدِ شباب اور ولولے کا اظہار بھرپور انداز میں ملتا ہے۔

کون ہے جس نے مے نہیں چکھی کون جھوٹی قسم اُٹھاتا ہے
مے کدے سے جو بچ نکلتا ہے تیری آنکھوں میں ڈوب جاتا ہے
(عدم)

قتیل شفائی کی غزل کا موضوع بھی سیاسی وسماجی صورت حال ہے۔ ان میں نغمگی اور موسیقیت ہے۔

ہر بے زباں کو شعلہ نوا کہہ لیا کرو
یارو سکوت ہی کو صدا کہہ لیا کرو
(قتیل شفائی)

۱۹۴۷ء سے ۱۹۶۰ء کے درمیان غزل کے میدان میں جو شعرا اپنے فن کی طاقت اور انفرادیت لیے جلوہ افروز ہوئے ان میں ناصر کاظمی، جمیل الدین عالی، ابن انشاء، حبیب جالب، عزیز حامد مدنی، احمد مشتاق، رسا چغتائی، ضمیر جعفری، سلیم احمد، محب عارفی، محبوب خزاں، شان الحق حقی، منیر نیازی، حمید نسیم، مصطفیٰ زیدی، فرید جاوید، اطہر نفیس، احمد فراز، حمایت علی شاعر، فارغ بخاری، خاطر غزنوی، عطا شاد، ظفر اقبال، شہزاد احمد، محشر بدایونی، جون ایلیا، رضی اختر شوق، انور مسعود، توصیف تبسم شامل ہیں۔

قیامِ پاکستان کے فوراً بعد جو رُجحان سامنے آتا ہے وہ تقلیدِ میر کا رجحان ہے۔ اگرچہ میر کے مقلدین کا پورا گروہ تھا جس میں حفیظ ہوشیارپوری، ابن انشا، سلیم احمد اور مختار صدیقی کے نام شامل ہیں۔ البتہ حقیقی نمائندگی صرف ناصر کاظمی کے حصہ میں آئی جس پر میر کے رنگ کی شاعری کے اثرات نمایاں ہیں۔

ناصر کاظمی نے پہلی بارش میں ایک ہی زمین میں ردیف و قافیہ میں مسلسل غزل لکھ کر نہ صرف غزل پہ لگائے گئے اس الزام کو مسترد کر دیا کہ غزل میں منتشر خیالی پائی جاتی ہے۔ یہ مجموعہ ابھی تک اپنی انفرادیت برقرار رکھے ہوئے ہے۔

میں نے جب لکھنا سیکھا تھا
پہلے تیرا نام لکھا تھا
میں وہ عزمِ صمیم ہوں جس نے
بارِ امانت سر پہ لیا تھا
(ناصر کاظمی)

بیسویں صدی میں غزل گو شعرا میں زندگی کو اجتماعی نقطہ نظر سے دیکھنے کی بجائے فرداً فرداً دیکھنے کا رویہ سامنے آیا۔ اس کے علاوہ کسی خاص فکر کی تشکیل کی بجائے محض جذبات واحساسات کے بیان کو ہی پیش نظر رکھا گیا۔ نمایاں رجحانات کے علاوہ انفرادی رجحانات کی مثالیں ملتی ہیں۔ ابن انشا کی غزل میں بحور استعارے، الفاظ اور مزاج خالصتاً مقامی ہیں۔ مگر ان کی غزل میں موسیقیت، سوز وگداز

CamScanner

اور لطافت کے ساتھ چاند کا استعارہ خاص اہمیت کا حامل ہے۔

ع چاند کی خاطر ضد نہیں کرتے
اے میرے بھولے انشاء چاند

اور

کل چودھویں کی رات تھی شب بھر رہا چرچا ترا
کچھ نے کہا یہ چاند ہے کچھ نے کہا چہرہ ترا
(ابن انشاء)

احمد مشتاق نے ۷۰ء کی دہائی میں جدید غزل کو نئے زاویوں سے آشنا کیا۔ اُن کی غزل نے قدیم موضوعات کو نئے رنگ میں پیش کیا۔ اُن کے ہاں غزل چمکدار ہوگئی ہے۔

یہ لوگ ٹوٹی ہوئی کشتیوں میں سوتے ہیں
مرے مکان سے دریا دکھائی دیتا ہے
یہ دریا خامشی سے بہہ رہا ہے
اسے دیکھیں کہ اس میں ڈوب جائیں

منیر نیازی کی غزل میں ہجرت اور خوف کے استعارے انوکھے انداز میں آئے ہیں جو کہ ایک ڈرے ہوئے شخص کی روداد بیان کرتے ہیں۔ تنہائی، ڈر، خوف، چڑچڑا پن زمانے سے بیزاری اور ان سب چیزوں کے ردِعمل سے مل کر ان کی غزل مکمل ہوتی ہے۔

اس شہر سنگ دل کو جلا دینا چاہیے
اور اس کی خاک کو بھی اُڑا دینا چاہیے
(منیر نیازی)

مصطفیٰ زیدی کے ہاں محبوب کے فراق میں سلگنے کی آرزو اور زندگی کے دکھوں اور خوشیوں کا اظہار کیا ہے۔

میں کس کے ہاتھ پہ اپنا لہو تلاش کروں
تمام شہر نے پہنے ہوئے ہیں دستانے

بیسویں صدی کی جدید غزل میں شہزاد احمد کا نام نہایت معتبر ہے۔ ان کے ہاں مختلف موضوعات پر نئے اور تازہ اشعار ملتے ہیں۔

بہت لوٹا ہے دل کو آگہی نے
اسے اب بے خبر کرنا پڑے گا

ظفر اقبال نے غزل کی روایت سے مکمل انحراف کر کے اپنی پہلی کتاب ''آبِ رواں'' کے بعد زبان اور موضوعات کی سطح پر کافی کام کیا لیکن اُن کا طرزِ سخن کا نیا تجربہ کامیاب نہ ہوسکا۔ کیونکہ اس سے مزید بگاڑ پیدا ہونے کا خدشہ تھا۔ تاہم اُن کے ہاں تمام موضوعات پر جدید اشعار ملتے ہیں۔ جو اَب تک روایت کا حصہ بنتے آرہے تھے۔

کاغذ کی ناؤ سر پہ سجا کر چلی حیات
نکلی بیرونِ شہر تو بارش نے آ لیا

احمد فراز کے ہاں سیاسی اور رومانوی دونوں رنگ چھائے ہوئے ہیں۔ جلاوطنی کے عہد کی غزلوں میں سیاسی شعور گہرا اور اجتماعی رنگ نمایاں ہے۔

سارا شہر بلکتا ہے
پھر بھی کیسا سکتہ ہے
(فراز)

بیسویں صدی کے نصف کے بعد اُردو غزل نے بڑے پیمانے پر کروٹ لی اور اُس میں تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ بقول ڈاکٹر سرور الہدیٰ:

''یہ کہنا شاید غلط نہ ہوگا کہ ۱۹۶۰ء کے بعد غزل میں زبان و اظہار کی سطح پر جتنی تبدیلیاں رونما ہوئیں اور جتنے تجربات ہوئے وہ اس سے پہلے نہیں ہوئے تھے۔'' (۷۰)

محشر بدایونی، جمیل الدین عالی، شان الحق حقی، فرید جاوید، اطہر نفیس، حمایت علی شاعر، فارغ بخاری، خاطر غزنوی، عطا شاد، جون ایلیا، رضی اختر شوق، انور مسعود، جمیل ملک، مشفق خواجہ، صادق نسیم، محسن احسان، وزیر آغا، ۶۰ء کی دہائی میں ایسے غزل گو شعرا ہیں جنہوں نے جدید پاکستانی غزل کے خدوخال تراشنے، سنوارنے اور نکھارنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

۶۰ء کی دہائی کے بعد شکیب جلالی، عبید اللہ علیم، انور شعور، ناصر شہزاد، سحر انصاری، نصیر ترابی، ریاض مجید، عدیم ہاشمی، اقبال ساجد، نذیر قیصر، مرتضیٰ برلاس، ظہور نظر، عبدالعزیز، خالد احمد، سیف زُلفی، بشیر احمد بشیر، جعفر شیرازی، اختر ہوشیار پوری

پیکر تراش شکیب جلالی نے لفظوں کی بجائے تصاویر میں سوچنا شروع کیا تو اس نئے اور منفرد لہجے نے آنے والے ادوار میں تمام شعرا کو متاثر کیا۔

آ گرا تھا کوئی پرندہ لہو میں تر
تصویر اپنی چھوڑ گیا ہے چٹان پر
(شکیب)

۶۰ء کی دہائی میں تشدد، وحشت، بربریت کے احساسات کے علاوہ فرد کی ذات کا تحفظ، اثبات کا مسئلہ بھی غزل کے عمومی رجحانات کی نشاندہی کرتا ہے۔

میں بھی عجیب شخص ہوں اتنا عجیب ہوں کہ بس
خود کو تباہ کر لیا اور ملال بھی نہیں
(جون ایلیا)

عجیب ہوتے ہیں آدابِ رُخصتِ محفل
کہ اُٹھ کے وہ بھی چلا جس کا گھر نہ تھا کوئی
(سحر انصاری)

اس دہائی میں جدید حقیقت پسندی کے تحت مزدوروں اور محنت کشوں کے مسائل بیان کرنے کا رُجحان بھی ایک نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ اس رُجحان کے نمائندہ شعرا میں تنویر سپرا، سبط علی صبا، علی مطہر اور اسلم کولسری ہیں۔

CamScanner

اے رات مجھے ماں کی طرح گود میں لے لے
دن بھر کی مشقت سے بدن ٹوٹ رہا ہے
(تنویر سپرا)

شہر میں آ کر پڑھنے والے بھول گئے
کس کی ماں نے کتنا زیور بیچا تھا
(اسلم کولسری)

۶۰ء کی دہائی میں پاکستانی اُردو غزل کا ایک نمایاں رُجحان قومی اور جمہوری خوابوں اور ان کی تعبیر کے لیے مشترکہ عملی جدوجہد کا ہے۔ اس میں غزل کی زبان، استعارے، تشبیہات اور علامتیں بھی تبدیل ہوتی چلی گئیں۔ بقول ڈاکٹر سرورالہدیٰ:

''نئی غزل میں جہاں استعارہ سازی پر کافی توجہ دی گئی اور اس سے غزل میں ایک نئے رنگ و آہنگ کا اضافہ ہوا وہیں دوسری طرف پیکریت بھی ایک اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔ پیکریت جدید تنقیدی اصطلاح ہے۔ پیکریت کی جتنی قسمیں ہو سکتی ہیں وہ سب نئی غزل میں موجود ہیں۔''(۱۷)

۷۰ء کی غزل میں نئے آفاق اور نئے امکانات کے متلاشی شعرا میں منظور عارف، افتخار عارف، رشید قیصرانی، اسلم انصاری، مظفر وارثی، رفعت سلطان، روحی کنجاہی، محسن بھوپالی، ناصر زیدی، افتخار نسیم، سلطان رشک، خورشید رضوی، خاقان خاور، آصف ثاقب، جمال احسانی، جمیل یوسف، سلیم کوثر، امجد اسلام امجد، نجیب احمد، خالد احمد، اشرف جاوید، گلزار بخاری، ستار سید، خادم رزمی، اظہر جاوید۔

بلند ہاتھوں میں زنجیر ڈال دیتے ہیں
عجیب رسم چلی ہے دُعا نہ دے کوئی
(افتخار عارف)

کسی کی آنکھ جو پرنم نہیں ہے
نہ سمجھو یہ کہ اُس کو غم نہیں ہے
(امجد اسلام امجد)

آخر میں ہنس پڑوں گا کسی ایک بات پر
رونا تمام عمر کا بیکار جائے
(خورشید رضوی)

چراغ سامنے والے مکان میں بھی نہ تھا
یہ سانحہ مرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا
(جمال احسانی)

ستر کی دہائی میں سقوطِ ڈھاکہ نے پاکستانی ادب بالخصوص غزل پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ اس سانحے نے تمام شعرا کو یکساں متاثر کیا۔

اب اُس کو کھو رہا ہوں بڑے اشتیاق سے
وہ جس کو ڈھونڈنے میں زمانے لگے مجھے
(محسن نقوی)

ستر کی دہائی میں جب محنت کش طبقہ روزگار کے سلسلے میں بیرونِ ملک گیا تو مزید تجربات و مشاہدات غزل کا حصہ بنے۔ ان شعرا میں شہزاد قمر، منور عزیز، قیوم طاہر، خالد اقبال یاسر، نصیر احمد ناصر، عدیم طاہر اور کاوش عباسی کے نام نمایاں ہیں۔ انہوں نے اس حوالے سے غزلیں لکھیں:

پروین شاکر نے اپنی تخلیقی انفرادیت کے سبب نوجوان نسل کے شعرا اور شاعرات کی مزاج سازی میں اہم کردار ادا کیا۔

کُو بہ کُو پھیل گئی بات شناسائی کی
اُس نے خوشبو کی طرح میری پذیرائی کی
(پروین شاکر)

کمالِ ضبط کو خود بھی تو آزماؤں گی
میں اپنے ہاتھ سے تیری دُلہن سجاؤں گی
(پروین شاکر)

ناہید قاسمی، شبنم شکیل، فاطمہ حسن، عرفانہ عزیز، شاہدہ حسن، سیدہ حنا، یاسمین حمید، نوشی گیلانی،

گزشتہ دو عشروں میں شعرا کی نئی کھیپ سامنے آئی ہے جن کے ہاں بیسویں صدی بلکہ کسی حد تک انیسویں صدی کے موضوعات کو نئے سلیقے، نئے اسلوب اور نئے رنگ سے غزل کے پیرہن میں پرونے اور سجانے کا سلسلہ جاری ہے۔ ۹۰ء کی دہائی سے بیسویں صدی کے اختتام تک غزل نے جتنے رنگ بدلے اور جتنی تبدیلیاں رونما ہوئیں ان سب کو اس نئی کھیپ کی غزل میں دیکھا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان شعرا کی غزلیں تمام تر انفرادیت کے باوجود یکسانیت کا شکار نظر آتی ہیں۔ کیونکہ نہ صرف مضامین کی سطح پر ان کے ہاں یکسانیت ہے۔ بلکہ اسلوب ڈکشن اور استعارے، تلمیحات، تشبیہات اور کرافٹ بھی ایک جیسا ہے۔ تقلیدِ میر کا رجحان ان شعرا کے ہاں دوبارہ رواج پا گیا ہے۔ شکیب اور احمد مشتاق کی شاعری کے اثرات بھی ان کے ہاں نمایاں ہیں۔ تاہم اس تمام صورت حال میں کئی شاعر ایسے ہیں جنہوں نے اپنے لیے نئی راہیں نکالی ہیں اور اپنی غزل کو نہ صرف موضوعات بلکہ ہر لحاظ سے علیحدہ کرنے کی بھرپور کوششیں کی ہیں اور اس میں کافی حد تک وہ کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ انکا تذکرہ اگلے ابواب میں آئے گا۔ بیسویں صدی کی غزل کے عام رجحانات میں تقلید میر و غالب، اقبال کی انقلابی شاعری، وطن پرستی، قیامِ پاکستان کے بعد نئے خواب کی تعبیر، ظلم و جبر کے خلاف آواز، زندگی اور شاعری کے درمیان مقصدیت اور مطابقت کی تلاش سانحہ سقوط پاکستان کے اثرات، اپنی شناخت، جدیدیت، تنہائی، وحشت، خوف اور محبت کے موضوعات شامل ہیں اور انہی موضوعات کے سہارے ہی نئی غزل کی عمارت مکمل شان و شوکت سے ایستادہ ہے۔

CamScanner

مسلمان سائنسی وعلمی میدان میں پیچھے کیوں ہیں؟

ثنا شعبان/لاہور

اس جدید دور میں دنیا کی مختلف قومیں ترقی کے راہ پر گامزن ہے۔ عصر حاضر کی قوموں نے ہر شعبہ ہائے زندگی میں ترقی کر کے پوری دنیا میں دھاک بٹھائی ہے۔ عصر حاضر میں بڑھتی ہوئی ٹیکنالوجی دنیا کی قوموں پر اثر انداز ہو رہی ہے۔ آج کے دور کے مسلمان مغرب کے پیروکار بن گئے ہیں۔ ان کے رہنے سہنے کے انداز، اوڑھنے کے انداز نیز ہر پہلو سے وہ مغرب قوم کی پیروی کر رہے ہیں اگر مسلمانوں کی تاریخ پر نظر دوڑائی جائے تو بہت سے عظیم سائنسدان گزرے جنہوں نے دنیا میں اپنی ساکھ قائم کی اور اگر آج کے مسلمانوں کو دیکھا جائے تو وہ علم سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔ وہ تعلیم بھی محض ڈگری لے کے ملازمت کرنے کے لیے، حاصل کر رہے ہیں۔ علم کا مطلب محض ڈگری حاصل کرنا نہیں ہے بلکہ علم تو سوجھ بوجھ اور شعور کا نام ہے۔ اور مسلمان علم اور فکر سے دور ہوتے جا رہے ہیں ہمارے آباء ؒ کا قیمتی سرمایہ آج یورپ کی لائبریریوں کی زینت بنا ہوا ہے۔ جیسا کہ علامہ اقبال افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں،

مگر وہ علم کے موتی، کتابیں اپنے آباء کی
جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارا

مسلمانوں کا قیمتی سرمایہ جو کہ سائنسی و علمی میدان میں ہماری مدد کرتا، جس سے ہم اپنی تاریخ، عظیم ماضی کو کبھی نہ بھولتے لیکن افسوس صد افسوس ہلاکو اور چنگیز خان نے وہ سرمایہ دریائے نیل اور انگریزوں کی نذر کر دیا۔ مسلمان اپنے عظیم ماضی کے ہوتے ہوئے، عظیم حال سے محروم ہیں۔ آج ہم اپنی زندگی میں جتنے بھی سائنسی آلات دیکھتے ہیں، اکثر و بیشتر انگریز سائنسدانوں کی مرہون منت ہیں۔

مسلمانوں کی سائنسی وعلمی میدان میں پیچھے ہونے کی وجوہات درج ذیل ہیں۔

پاکستان اور دوسرے مسلم ممالک آج بھی ترقی پذیر ممالک میں شمار ہوتے ہیں۔ یہاں کے تعلیمی ادارے اور تجربہ گاہیں خستہ حال ہیں۔ جہاں تعلیمی اداروں میں سائنس لیب میں پڑا ہوا سامان اور تکنیکی آلات صرف دیکھنے کی اجازت ہے، استعمال کرنے کی نہیں۔ وہاں کس طرح ممکن ہے کہ اس ادارے سے طالب علم سائنسدان بن کر نکلے گے یا مفکر۔ ان کو وہ مشینری اور آلات استعمال کرنے کی اجازت ہی نہیں اگر چند ایک اداروں میں اجازت مل بھی جاتی تو اول تو نہ ہونے کے برابر ہوگی دوم ان آلات کی کارگردگی اچھی نہ ہوگی جن کو استعمال کرنا، گویا کہ نہ کرنے کے برابر ہو۔ ایسے میں طالب علموں کے لیے سیکھنے کے مواقع بہت کم ہو جاتے اور وہ علمی اور فکری لحاظ سے بہت پیچھے رہ جاتے ہیں اور اس کے برعکس سائنسدان تو علمی تدبر و تفکر سے بنتے ہیں۔

دوسری اہم وجہ مسلمانوں کی سائنسی اور علمی میدان میں ترقی کے فقدان میں تجربہ کار اور ہنرمند لوگوں کی کمی ہے۔ تعلیمی اداروں میں طلباء کو محض نمبر لینے کے لیے پڑھایا جاتا ہے اور بورڈ میں پوزیشنز کیسے لینی ہیں۔ اس طرح بچے کچھ نہیں سیکھ پاتے۔ ہم کسی بھی میدان میں تب تک ترقی نہیں کر سکتے جب تک ہمیں اس بارے صحیح سے علم نہ ہو اور مکمل معلومات نہ ہو۔ بچوں کو شروع سے ہی چیزوں کا شعور دیا جائے، انہیں تجربہ کرنے سے کبھی نہیں گھبرانا چاہیے۔ انسان ہمیشہ تجربہ کر لے سے سیکھتا ہے۔ ہر نئی مرتبہ تجربہ کرنے سے اسے سمجھ آتی ہے کہ میں پچھلی مرتبہ ناکام کیوں ہوا اور اس دفعہ مجھے کسی عوامل پر اچھے سے کام کرنا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

انسان کے لیے وہی ہے جس کے لیے اس نے کوشش کی۔ (القرآن)

اگر ہمارے تعلیمی اداروں میں تربیت یافتہ لوگ بچوں کی اچھے سے نشوونما اور ان کی تربیت کریں گے تو مسلمان کبھی بھی سائنسی وعلمی میدان میں پیچھے نہیں رہ سکتے۔

عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں
نظر آتی ہے ان کو اپنی منزل آسمانوں میں
(علامہ اقبال)

مسلمانوں کی سائنسی وعلمی میدان میں پیچھے، کی تیسری اہم وجہ تعلیمی بجٹ ہے۔ یہ بجٹ انتہائی کم رکھا جاتا ہے۔ ملک کے تعلیمی اخراجات پورے نہیں ہوتے۔ اس بات کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ مسلم ملکوں میں صرف 498 یونیورسٹیاں ہیں جبکہ امریکہ میں 5758 یونیورسٹیاں ہیں اور بھارت میں امریکہ سے بھی زیادہ 8500 یونیورسٹیاں ہیں۔

مسلم ممالک میں شرح خواندگی 25 سے 28 فیصد کے درمیان ہے اور کچھ میں تو محض دس فیصد ہے ایسے ممالک کی تعداد 25 کے لگ بھگ ہے۔

ایک رپورٹ مطابق او آئی سی میں 76 مسلم ملک شامل ہیں اور اس بین الاقوامی سطح کی محض 5 یونیورسٹیاں ہیں جبکہ امریکہ میں 6 ہزار جاپان میں نوسو پچاس، چین میں نوسو اور بھارت میں 8500 بھی اور سرکاری یونیورسٹیاں کام کر رہی ہیں۔ پوری دنیا میں یہودیوں کی تعداد ایک کروڑ چالیس لاکھ ہے اور مسلمان سوا ارب یعنی ایک یہودی سو مسلمانوں پر بھاری ہے۔ گزشتہ ایک صدی میں 71 یہودی تحقیق، سائنس اور ادب کے شعبے میں نمایاں خدمات سرانجام دینے کے عوض نوبل انعام حاصل کر چکے ہیں۔ جبکہ

مسلم ممالک میں صرف 3 افراد نے یہ انعام حاصل کیا۔

یہ بات نیل کے ساحل سے لے کر تا بخاک کاشغر کے مسلمانوں کے لیے شرم کی باعث نہیں کہ ڈیڑھ کروڑ یہودی ہر میدان میں پیش پیش ہیں۔ اسلام کا فلسفہِ زندگی یہ نہیں چند مفروضوں مبنی عقائد و نظریات کو انسانی صلاحیتوں پر اثر انداز کیا جائے اور حقیقت کے سفر میں انسان کو بوجھل کیا جائے۔ اسلام تو عالمگیریت ہے۔ اسلام تو تدبر و تفکر کرنے کا حکم دیتا ہے۔ قرآن میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔

ترجمہ: بیشک آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں اور رات دِن کی گردش میں اور اُن جہازوں (اور کشتیوں) میں جو سمندر میں لوگوں کو نفع پہنچانے والی چیزیں اُٹھا کر چلتی ہیں اور اُس (بارش) کے پانی میں جسے اللہ آسمان کی طرف سے اُتارتا ہے، پھر اُس کے ذریعے زمین کو مُردہ ہو جانے کے بعد زندہ کرتا ہے، (وہ زمین) جس میں اُس نے ہر قسم کے جانور پھیلا دیئے ہیں اور ہواؤں کے رُخ بدلنے میں اور اُس بادل میں جو آسمان اور زمین کے درمیان (حکمِ الٰہی کا) پابند (ہو کر چلتا) ہے (اِن میں) عقلمندوں کے لئے (قدرتِ الٰہیہ کی بہت سی) نشانیاں ہیں۔

اسی طرح ایک اور جگہ ارشاد ہے:

ترجمہ: اور آسمانوں اور زمین کی پیدائش اور تمہاری زبانوں اور تمہارے رنگوں کا اختلاف اُس کی نشانیوں میں سے ہے۔ بیشک اِس میں علم رکھنے والوں کے لئے (حیرت انگیز اور مستند) نشانیاں ہیں۔

ان آیات سے واضح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات میں اہل علم والوں کے لیے نشانیاں رکھی ہیں۔ غور و خوض اور تدبر و تفکر تو حکم خداوندی ہے۔ کیوں کہ تفکر کے بغیر سوچ کے دروازے کھلتے ہیں اور اگر یہ دروازے مقفل رہیں تو تاریخ کا سفر گویا رک جاتا ہے۔ اور آج کے مسلمانوں نے اپنی سوچ کو مقفل کر دیا ہے۔

کسی زمانے میں اسلامی حکومتوں کے زیر سایہ نئی ایجادات ہوئیں اور بڑے بڑے سائنسداں، حکماء اور ڈاکٹر پیدا ہوئے مگر آج حالات اس سے مختلف ہیں۔

آج کوئی ابو علی ابن سینا، ابن ہیثم اور ابن رشد سامنے نہیں آتا۔ جابر بن حیان جیسے کیمیا داں آج دنیا کی رہنمائی کیوں نہیں کرتے ہیں؟ آج کوئی زکریا رازی اور ابوالقاسم زہراوی علم وہنر کے آسمان پر کیوں نہیں چھاتا؟ موجودہ سائنسی دنیا میں مسلمانوں کی بے وقعتی کو دیکھتے ہوئے کسی نے کہا تھا کہ آج اگر مسلم سائنسدان یکسر دنیا سے ختم ہو جائیں تو کسی کو احساس بھی نہیں ہوگا کہ وہ موجود تھے۔ جب مسلمانوں کے عروج کا زمانہ تھا اور خلافت راشدہ کے بعد بنو امیہ و بنو عباس کا دور آیا تو جابر بن حیان، زکریا رازی، قاسم زہراوی اور ابن سینا جیسے سائنس وطب کے ماہرین پیدا ہوئے جنہوں نے جدید سائنس کی بنیاد رکھی اور ان کی ایجادات واختراعات اور تحقیقی کتب سے ہی استفادہ کر کے مغرب کے اہل علم نے سائنس وطب کو جدید رنگ وآہنگ عطا کیا۔ اس عہد کے مسلم حکمرانوں نے بھی سائنس وطب کی سرپرستی کی۔

ذرا اپنے ماضی کی طرف دیکھو۔

عہدِ وسطیٰ کے مسلمان سائنس دانوں نے بڑی بڑی ایجادیں کی ہیں۔ ان میں جابر بن حیان کا نام سر فہرست ہے، جس کی کیمیا میں مہارت کی وجہ سے اسے آج بھی chemistry of Father کہا جاتا ہے۔ آٹھویں صدی عیسوی کے اس عظیم سائنس داں کو آج کی مغربی دنیا Gaber کے نام سے جانتی ہے اور اس کی تحریر کردہ کتابیں آج بھی علم وفن کے خزانے تقسیم کر رہی ہیں۔ الجبرا اسی کی تحریر کردہ کتاب ہے جو مشرق سے مغرب تک اسکولوں مین داخل نصاب ہے۔

کیا اب بھی وقت نہیں آیا؟

مسلمانوں نے اپنے سنہرے دور میں بڑے بڑے علمی کارنامے انجام دیئے۔ طب، جراحت اور کیمیا ہی نہیں دیگر شعبوں میں بھی ان کی خدمات قابل فخر ہیں مگر کس قدر عجیب بات ہے کہ آج وہی مسلمان سائنس اور طبی علوم میں سب سے آخری صف میں نظر آتے ہیں۔ پاکستان جیسے ملکوں میں جو اکا دکا سائنس داں موجود ہیں ان کی علمی لیاقت بھی شکوک کے گھیرے میں ہے۔

آج مسلمانوں کو اپنا کھویا ہوا وقار واپس لانے کی ضرورت ہے۔ ہمیں اپنا تعلیمی بجٹ بڑھانا چاہیے تا کہ پاکستان کے تعلیمی اداروں میں طلباء کو بہتر سہولیات مہیا کی جا سکیں۔ زیادہ سے زیادہ اعلیٰ یونیورسٹیوں کا قیام عمل میں لایا جائے جن میں طلباء کو جدید سہولیات میسر ہوں۔ مسلمان اپنی شوکت رفتہ کی بازیابی کے لئے سائنس وحکمت میں میدان میں آگے آئیں اور مغرب کے شانہ بہ شانہ چلنے کا حوصلہ پیدا کریں۔

آج طلبہ اعلیٰ تعلیم کے لئے امریکہ و یورپ جاتے ہیں کیوں کہ وہاں پر بہترین سہولیات میسر ہیں، پاکستان اور دوسرے مسلم ممالک کو سائنس کے میدان میں کمزور پہلوؤں پر توجہ کی ضرورت ہے تا کہ طلبہ اپنے ملک میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکیں۔

جس طرح عباسی دور میں بغداد علم وفن کا مرکز تھا مسلمانوں کو اپنی تاریخ زندہ کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر مسلمان اپنی تدبر و تفکر کی عادت اپناتے ہیں تو آج بھی مسلمان اپنا کھویا ہوا مقام واپس کر لیں گے بس پختہ ارادہ کی ضرورت ہے اور علامہ اقبال تو جوانان مسلم کو شاہین سے مخاطب کرتے تھے۔

کبھی اے نو جوان مسلم تدبر بھی کیا تو نے
وہ کیا گردوں تھا تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا

صنفی برابری میں پاکستان کی حالت

عامر بن علی/ جاپان

ورلڈ اکنامک فورم ایک معتبر خودمختار ادارہ ہے۔ معیشت کے شعبے میں عالمی سطح پر نجی اور سرکاری شعبوں کے باہمی تعاون کا فروغ اس ادارے کا بنیادی مقصد بیان کیا جاتا ہے۔ مختلف معاشی موضوعات پر اپنے تحقیقی مقالہ جات کے علاوہ مشاہیر کو اپنی تقریبات، مباحثوں، میں شریک رکھنے کے سبب یہ ادارہ اکثر خبروں کا موضوع رہتا ہے۔ اس مرتبہ موضوع بحث اس ادارے کی جاری کردہ صنفی امتیاز کے متعلق ایک سالانہ رپورٹ ہے جسے ''گلوبل جینڈر گیپ'' کا نام دیا گیا ہے۔ میں اپنی تحریروں میں انگریزی الفاظ کا استعمال کرنے سے حتی الامکان پرہیز کرتا ہوں مگر کہیں کہیں یہ آج کل ناگزیر ہو جاتا ہے۔ مردوں اور عورتوں کو دنیا میں دستیاب مواقع اس طرح جانچے گئے ہیں کہ ان کی بنیاد پر اس عالم رنگ و بو کے تمام ممالک کی ایک فہرست بنادی گئی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس صنفی برابری کی فہرست میں شامل 149 ممالک میں پاکستان کو 148 ویں نمبر پر رکھا گیا ہے۔ مختلف موضوعات پر عالمی اداروں کی اس طرح کی رپورٹیں آتی رہتی ہیں، اکثر نظرانداز بھی کر دی جاتی ہیں، مگر یہ رپورٹ میرا موضوع سخن یوں بنی کی صدر عارف علوی نے اپنے سرکاری ٹویٹر اکاؤنٹ سے اس موضوع پر اظہار خیال فرمایا ہے، اپنی تشویش کا اظہار کیا ہے اور انتظامیہ، مقننہ کے ساتھ ساتھ عدلیہ سے بھی اس صورتحال کا نوٹس لینے کے لئے کہا ہے۔

صنفی برابری کی عالمی درجہ بندی جسے ورلڈ اکنامک فورم نے یوں ترتیب دیا ہے، کہ اس فہرست میں میرے ملک کا حال یمن سے قدرے بہتر ہے، مگر باقی دنیا کے مقابلے میں بدتر قرار دیا گیا ہے، اس کی بنیاد چار شعبہ ہائے زندگی ہیں، سیاست، معیشت، صحت اور تعلیم۔ خواتین کی نمائندگی کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ سیاست کے شعبے میں حاصل اختیارات کو غالبًا بہت زیادہ اہمیت دی گئی ہے، شاید یہی وجہ ہے کہ بنگلہ دیش میں اس رپورٹ کے مطابق حالات امریکہ اور روس سے بہت بہتر ہیں۔ چونکہ بنگلہ دیش کا نمبر 48 واں ہے، جبکہ امریکہ اکیاون ویں نمبر پر ہے اور روس 75 ویں نمبر پر جگہ بنا سکا ہے۔ اقتصادی مواقع کی جنس یا صنف کی بنیاد پر تفریق کی بات کریں تو پھر سری لنکا چین سے بہتر دکھایا گیا ہے اور ہندوستان کہیں 108 ویں نمبر پر ہے۔ صحت اور تعلیم کے شعبہ جات بھی کارکردگی کا جائزہ لینے کے لئے جانچے گئے ہیں۔ جس کا نتیجہ ہمارے سامنے ہے، جو کہ اس سالانہ صنفی برابری کی عالمی درجہ بندی رپورٹ میں شائع ہوا ہے۔

میں اس رپوٹ کے معتبر ہونے یا غیر معتبر ہونے پر استدلال نہیں دوں گا، جس میں افریقہ کا فاقہ زدہ ملک چھٹے نمبر پر ہے اور جاپان 110 ویں نمبر پر ہے، باالفاظ دیگر جاپان کو روانڈا کا مقام حاصل کرنا ہے تو اسے کئی دہائیاں اور سخت محنت کرنا درکار ہوگی۔ جاپان کی پوزیشن پچھلے سال سے چار درجے بہتر ہوئی ہے۔ چونکہ وہ 114 ویں نمبر پر تھا بقول 2017 رپورٹ۔ عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ایک ایسی رپورٹ جس میں روانڈا، نمیبیا، نکاراگوا اور بنگلہ دیش دنیا کے معاشی وعسکری لحاظ سے مضبوط ترین ممالک امریکہ، چین، جاپان اور روس سے بہت آگے ہوں گے، بلکہ آئیڈیل نظر آ رہے ہوں، G8 ممالک کے لئے مشعل راہ ہوں، اس طرح کی کسی فہرست کے متعلق ہم سے زیادہ دوسری اقوام کو فکر کرنی چاہیے۔ ہمیں زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہماری پریشانی کا سبب دیگر موضوعات ہونے چاہئیں، ان میں سرفہرست معیشت ہے جو کہ مسلسل گراوٹ کا شکار ہے۔ پاکستان کی شرح نمو بڑی تیزی سے نیچے گر رہی ہے، روپے کی تاریخی بے قدری ہو رہی ہے۔ بے روزگاری اور مہنگائی روشنی کی رفتار سے بڑھ رہی ہے۔ ان باتوں کا نوٹس لینے کی ضرورت ہے اور وہ بھی فوری طور پر۔ ورلڈ اکنامک فورم کے سوئٹزرلینڈ میں بیٹھے بیوروکریٹ ٹائپ ملازمین جو اپنی تنخواہیں کھری کرنے کے لئے کچھ نہ کچھ چھاپتے رہتے ہیں، وہ پاکستان اور اس کے حقیقی مسائل کو پاکستانیوں سے بہتر نہیں جانتے ہیں، اور نہ ہی جان سکتے ہیں۔ ان کے قائم کردہ معیارات پر پورا اترنا ہمارا مسئلہ نہیں ہونا چاہئے۔

اسلام کی ڈیڑھ ہزار سال کی تاریخ ہے اور ساٹھ ممالک میں مسلمان اکثریت میں ہیں، مگر یہ اعزاز ہمارے وطن پاکستان کا ہے کہ اس نے اسلامی تاریخ میں پہلی مرتبہ ایک خاتون محترمہ بے نظیر بھٹو کو وزیراعظم منتخب کیا تھا۔ اسلامی دنیا میں عرب، ایران کی بات ہی نہیں، ترکی، ملائشیا، انڈنیشیا جیسے ممالک سیاسی، سماجی اور معاشی اعتبار سے قدرے جدید ممالک بھی آتے ہیں، مگر صنفی برابری کی سیاست اور سماج میں مثالل قائم کرنا پاکستانی قوم کا اعزاز ہے۔ جبکہ امریکہ جیسی سپر پاور ریاست میں آج تک کوئی خاتون ملک کی سربراہ منتخب نہیں ہوئی ہے۔ گزشتہ امریکی انتخابات میں بڑی مشکل سے ہیلری کلنٹن صدارتی امیدوار بن پائیں، مگر آج ڈونلڈ ٹرمپ صرف اس بنیاد پر امریکی صدر منتخب ہوا بیٹھا ہے چونکہ اس ملک کی عوام ایک عورت کو صدر نہیں بنانا چاہتے تھے۔ خواتین کے متعلق پاکستانیوں کا عمومی رویہ تکریم کا ہے۔ سماج میں جنسی تفریق اور صنفی امتیاز بلاشبہ ایک اہم مسئلہ ہے۔ مگر غربت اور بے روزگاری زیادہ اہم معاملہ ہے۔ چونکہ یہ عورت اور مرد دونوں کا مسئلہ ہے۔ آخر میں صدرِ مملکت سے دست بستہ گزارش ہے کہ صدر پاکستان کے سرکاری ٹوئیٹر ہینڈل سے اس طرح کے پیغامات آپ کے منصب کی توہین ہیں۔ آپ نے جو عدالت عالیہ سے ورلڈ اکنامک فورم کی رپورٹ کا نوٹس لینے کا کہا ہے وہ کسی طور پر جائز نہیں ہے۔ ایسی خبروں کا نوٹس لینا عدالت عظمیٰ کا کام نہیں ہے۔ عدالت کے ذمے اس سے زیادہ ضروری کام ہے کہ، اور وہ کام خلقِ خدا کو انصاف کی فراہمی ہے۔

ڈاکٹر جنید آذر/اسلام آباد

یوں بھی ہوتا ہے کسی یاد سے لپٹے ہوئے رنگ
دُھوپ کی طرح سحابوں سے نکل آتے ہیں

چھپے ہوئے تھے جو موسم کے ڈر، نکلنے لگے
ہوئی جو شام تو شاخوں پہ سر نکلنے لگے

چمک ہی ایسی تھی چشمِ ہوس کے حلقے میں
سب اپنے اپنے بدن چھوڑ کر نکلنے لگے

میں سوچتا تھا خزانے دبے ہوئے ہوں گے
زمیں جو کھودی تو سانپوں کے گھر نکلنے لگے

کھڑی تھی سامنے دیوار... بے بسی لے کر
ابھی چھوا بھی نہیں تھا کہ در نکلنے لگے

ذرا سی دیر تھا وہ خوش جمال منظر پر
پھر اُس کو دیکھنے سب بدنظر نکلنے لگے

تمام عمر... میں چھاؤں کو اتنا ترسا ہوں
کہ اب مرے ہی بدن سے شجر نکلنے لگے

یہیں کہیں کسی جنگل میں بیٹھ جاتے ہیں
کسے خبر کہ یہیں رہگزر نکلنے لگے

جدھر سے روک رہی ہے مجھے تری خواہش
عجب نہیں کہ یہ دُنیا اُدھر نکلنے لگے

ترے خیال کا رستہ عجیب رستہ ہے
قدم قدم پہ ہزاروں سفر نکلنے لگے

یہ خواہشیں مری اوقات بھول جاتی ہیں
فلک کو سوچا... تو میرے بھی پر نکلنے لگے

سحر سے پہلے ہی تعویذ باندھ لو آذرؔ
یہی نہ ہو کہ دُعا کا اثر نکلنے لگے

پھر رہا ہوں اِس طرح سے دل میں لے کر ڈر کھلے
چھوڑ آئے جس طرح دلہن کوئی زیور کھلے

اب جو یہ اُجڑے ہوئے رہتے ہیں بام و در "کھلے"
دشمنوں نے دیکھ رکھے تھے ہمارے گھر کھلے

انکشافِ کائناتِ جذب و مستی کا طلسم
دیکھ لینا... جس گھڑی درویش کی چادر کھلے

اب مری حیرانیوں کی دسترس میں آ گیا
وہ دریچہ جو حدِ افلاک سے اُوپر کھلے

بڑھتی جاتی ہے ہوس خود رَو درختوں کی طرح
سرسراتے پھر رہے ہیں شہر میں اژدر کھلے

اور بھی اُجلا ہوا ہے منظرِ صحنِ چمن
سبزۂ شاداب پر شبنم کے جب پیکر کھلے

سازشیں بے باک لہجوں کی نمایاں ہو گئیں
شہر میں پھرتا ہے لے کر خط جو نامہ بر "کھلے"

برسرِ پیکار تھے بینائیوں سے ہر گھڑی
جس قدر بھی رنگ میری آنکھ کے اندر کھلے

دیکھ کر جلتا رہے آذرؔ سیہ بختی مری
سینۂ مہتاب میں وہ داغ جو شب بھر "کھلے"

وقت کے گہرے سرابوں سے نکل آتے ہیں
اُس کے خط اب بھی کتابوں سے نکل آتے ہیں

اُس کی یادوں سے مہکتے ہوئے لمحے اکثر
رقص کرتے ہوئے خوابوں سے نکل آتے ہیں

دھیان میں لاتا ہوں جب اُس کی غزالی آنکھیں
ذائقے تیز شرابوں سے نکل آتے ہیں

کتنے موسم کسی چہرے کی پذیرائی کو
خوشبوئیں لے کے گلابوں سے نکل آتے ہیں

اُس کا غم شاملِ احساس جہاں ہوتا ہے
ہم بھی دُنیا کے عذابوں سے نکل آتے ہیں

یاد آتے ہی کوئی... روح میں ٹھہرے ہوئے غم
خیمۂ جاں کی طنابوں سے نکل آتے ہیں

یوں بھی ہوتا ہے کسی یاد سے لپٹے ہوئے رنگ
دُھوپ کی طرح سحابوں سے نکل آتے ہیں

گھیر لیتی ہیں سوالوں بھری آنکھیں مجھ کو
دل کے غم میرے جوابوں سے نکل آتے ہیں

دیکھتے ہیں ہمیں حیرت سے سوالی منظر
ہم خموشی سے خرابوں سے نکل آتے ہیں

میں کب سے دیکھ رہا ہوں تری رُتوں کی طرف
ترا ہی دھیان نہیں ہے مرے دنوں کی طرف

اُسے کہو! کہ وہ اب کوئی فیصلہ کر لے
مرا بنے یا چلا جائے دشمنوں کی طرف

جو دشمنوں میں گھرا تو کمک نہیں آئی
میں دیکھتا ہی رہا اپنے دوستوں کی طرف

سمجھ میں آئے گا تیری بھی... ہجر کیا دُکھ ہے
کبھی نگاہ تو کر سوکھی ٹہنیوں کی طرف

یہ معجزہ ہے محبت کا ... دشت ہو کر بھی
میں لہر لہر بہا اُن کے ساحلوں کی طرف

مرے غنیم! بچا لیں بصارتیں اپنی
پلٹ رہا ہے مرا عکس آئنوں کی طرف

نجانے کب سے اَن دیکھی زمینوں میں پڑا ہوں
کسی کو کیا خبر میں کن دفینوں میں پڑا ہوں

کسی تقویم میں ہوتا نہیں ہے ذکر جن کا
خدا جانے میں کیوں ایسے مہینوں میں پڑا ہوں

کوئی سورج کرے آ کر کسی دن رونمائی
کہ میں اِک عمر سے پردہ نشینوں میں پڑا ہوں

مجھے موجود کے تاریک لمحوں میں نہ ڈھونڈو
میں عہدِ رفتہ کی روشن جبینوں میں پڑا ہوں

مرا اعزاز ... مجھ کو دی سرشتِ خوش قرینہ
مرا یہ سانحہ ... میں بے قرینوں میں پڑا ہوں

مرے منظر سے کتنے اور منظر پھوٹتے ہیں
کرن ہوں، روشنی ہوں اور نگینوں میں پڑا ہوں

کبھی جا کر ... کسی منزل پہ جو کھلتے نہیں ہیں
تحیر کے معلق ایسے زینوں میں پڑا ہوں

بہت سے سانپ ہیں میرے محافظ دھیان رکھنا
قدیمی عہد کے خفتہ خزینوں میں پڑا ہوں

مظہر امام/امریکا

جو بند بناؤ گے بہا دے گا اُسے بھی
سیلاب کے رستے تو بنائے نہیں بنتے

خط لکھا تھا مجھے تحفے میں گلاب آئے ہیں
میرے سارے ہی سوالوں کے جواب آئے ہیں
یہ الگ بات کہ ہم ٹوٹ کے بکھرے تو نہیں
لیکن اس عہد میں کتنے ہی عذاب آئے ہیں
پھر کسی شخص کے چہرے پہ اُداسی دیکھی
پھر ہمیں یاد جدائی کے وہ باب آئے ہیں
فاصلہ بڑھتا گیا ترکِ ملاقات کے بعد
ہم ملے ان سے کبھی اور نہ جناب آئے ہیں
ہم سفر چھوڑ گئے تنہا ہمیں جانِ امام
راستہ بھول گئے اتنے سراب آئے ہیں

صورت بجھی بجھی ہے کچھ تو ہمیں بتاؤ
حالت بھی واجبی ہے کچھ تو ہمیں بتاؤ
مانا گزر رہی ہے میرے بغیر لیکن
کیسے گزر رہی ہے کچھ تو ہمیں بتاؤ
شاید اُداسیوں سے گھبرا کے رو دیے ہو
یہ بات سرسری ہے کچھ تو ہمیں بتاؤ
ہر شخص کے لبوں پر محفل میں ذکر اس کا
وہ کون اجنبی ہے کچھ تو ہمیں بتاؤ
چپکے سے پی رہا ہوں ساقی پلا رہا ہے
مُلا کو کیا پڑی ہے کچھ تو ہمیں بتاؤ
دن بھی گزر گیا ہے آیا نہ آنے والا
پھر رات ہو گئی ہے کچھ تو ہمیں بتاؤ
اس ہاتھ سے کرو گے آغازِ دوستی بھی
جس ہاتھ میں چھری ہے کچھ تو ہمیں بتاؤ
کچھ بیچ کر خریدیں یا قرض لے کے بیگم
زیور یہ قیمتی ہے کچھ تو ہمیں بتاؤ
پچیس سال سے ہے ساتھی امام تیرا
کیسا وہ آدمی ہے کچھ تو ہمیں بتاؤ

فرہاد نہ رانجھے تو بنائے نہیں بنتے
ہر بات کے قصے تو بنائے نہیں بنتے
اشکوں کی زبانی جو ادا ہو تو مناسب
جذبات کے رقعے تو بنائے نہیں بنتے
سوچوں سے بہت دور وجود ان کا بنا ہے
یہ درد کے رشتے تو بنائے نہیں بنتے
دنیا کو گلے مجھ سے، شکایت ہے مجھے بھی
یک طرفہ یہ شکوے تو بنائے نہیں بنتے
یہ دور خرافات سہی اس کو رقم کر
تاریخ کے لمحے تو بنائے نہیں بنتے
جو بند بناؤ گے بہا دے گا اسے بھی
سیلاب کے رستے تو بنائے نہیں بنتے

اس زمانے کے نئے رنگ میں ڈھلنا چاہوں
وقت کے ساتھ میں خود آپ بدلنا چاہوں
ایسی تو بات کرے، لوگ وضاحت مانگیں
اس برے وقت سے پہلے میں بچھڑنا چاہوں
آبشاروں سے جدا کر کے روانی دے دے
میں ندی بن کے سمندر میں اُترنا چاہوں
میرا سچ اس کے لیے موت کا پروانہ ہے
میں عدالت میں گواہی سے مکرنا چاہوں
اس بلندی نے بہت دور کیا اپنوں سے
آسماں چھوڑ میں دھرتی پہ اُترنا چاہوں
ہر مسافر کے لیے رات کو جگنو کی طرح
روشنی بن کے میں رستے میں بکھرنا چاہوں
عید ہے آج مرے اپنے مرے پاس نہیں
آج میں کس کے لیے بننا سنورنا چاہوں
منفرد ہو مری پہچان گلابوں جیسی
دل میں دھڑکن کی طرح سب کے ٹھہرنا چاہوں
مجھ کو ڈر لگتا ہے محتاج بڑھاپے سے امام
بس کسی روز اچانک میں گزرنا چاہوں

جب سفر میں ہم سفر ملتا نہیں
پھر اکیلے راستہ کٹتا نہیں
وہ بدلتے موسموں کا ہم مزاج
قول سے پھرنا ہمیں آتا نہیں
تخت یا تختہ سیاست کا اصول
درمیاں کا راستہ ہوتا نہیں
بارشوں سے گر گئے کچے مکاں
بارشوں کا سلسلہ تھمتا نہیں
دل میں جو آئے غلط ہو یا درست
کر گزرتا ہوں کبھی سوچا نہیں
میرے دشمن بھی کریں گے اعتراف
ٹوٹ کر بھی میں کبھی بکھرا نہیں
ایک عادت ہے ہماری یہ جناب
جس کو چاہا ہے اسے پرکھا نہیں

پستی کی زد میں آ گئے مینار دیکھنا
ردی کے بھاؤ بک گئے اخبار دیکھنا
دن چڑھ گیا تو اب کوئی مصروفیت نکال
یہ دن بھی بیت جائے نہ بیکار دیکھنا
اس درجہ سر پہ آ پڑا ہے زندگی کا بوجھ
ہر شخص خود سے ہو گیا بے زار دیکھنا
ہونے لگی ہے تیز تری آرزو کی دھوپ
کوئی نہیں ہے سایۂ دیوار دیکھنا
دشمن کے پاس جانے سے پہلے یہ سوچ لیں
پھر سے نہ پھینک دے کوئی ہتھیار دیکھنا
جو اپنے بازوؤں پہ بھروسہ کرے امام
دریا میں پھینک دے گا وہ پتوار دیکھنا

افتخار شوکت/لاہور

تم یونہی دور رہا کرتے ہو ہم سے ورنہ
جس کو چھو لیں اُسے شہکار بنا دیتے ہیں

سیدھے سادوں کو بھی ہشیار بنا دیتے ہیں
دھوکے دنیا کے سمجھدار بنا دیتے ہیں
اپنی آنکھوں میں محبت کے سوا کچھ بھی نہیں
جس کو بھی دیکھیں چمکدار بنا دیتے ہیں
بات اتنی ہے کہ جو اس کو پسند آتا ہے
ہم اسی چیز کو معیار بنا دیتے ہیں
پہلے ہجرت پہ کیا جاتا ہے مجبور ہمیں
اور پھر رستہ بھی دشوار بنا دیتے ہیں
تم یونہی دور رہا کرتے ہو ہم سے ورنہ
جس کو چھو لیں اسے شہکار بنا دیتے ہیں
ہم جنہیں دیکھ کے جیتے ہیں وہ چہرے شوکت
دیکھتے دیکھتے بیمار بنا دیتے ہیں

کوئی تو بات ہے کچھ دن سے ہاں خاموش رہتے ہیں
وگرنہ سر پھرے ہم سے کہاں خاموش رہتے ہیں
بہت مانوس ہوتے ہیں در و دیوار انساں سے
مکیں جب چھوڑ جائیں تو مکاں خاموش رہتے ہیں
یہی اک جرم ہے جس نے یہاں تک ہم کو پہنچایا
جہاں پر بولنا ہو ہم وہاں خاموش رہتے ہیں
کہانی میں فقط ان کا یہی کردار ہوتا ہے
جو ہوتے ہیں بہت ہی مہرباں، خاموش رہتے ہیں
وگرنہ بات کیا ہے جو ہمیں کرنا نہیں آتی
تمہارے سامنے ہم جانِ جاں خاموش رہتے ہیں
محبت میں اک ایسا موڑ بھی آتا ہے جب شوکت
یقیں خاموش رہتے ہیں گماں خاموش رہتے ہیں

آزمائے دوستوں کو آزمائیں کس لیے
روز و شب ہم پھر سے اپنا جی جلائیں کس لیے
ہر صدا ہے ایک دھوکہ، ہر نظر ہے اک فریب
اب کسی آواز پر ہم اُٹھ کے جائیں کس لیے
ایک مدت ہو گئی ہے خود کلامی چھوڑ دی
انہی باتوں سے خود اپنا دل دکھائیں کس لیے
ان کو کیا حق ہے کہ مجھ سے چھین لیں صبر و قرار
ان کو کیا حق ہے مری نیندیں اُڑائیں کس لیے
جانتا ہوں چاہوں بھی تو پورے کر سکتا نہیں
پھر کسی معصوم کو سپنے دکھاؤں کس لیے
شام اس سے کون سی ہوگی سہانی افتخار
جلدی جلدی دن کو اپنے میں بتاؤں کس لیے

منت سے ملا مجھ کو نہ منت سے ملا تھا
یہ مرتبۂ عشق رفاقت سے ملا تھا
تھی ملنے کی جتنی بھی خوشی دکھ بھی تھا اُتنا
وہ مجھ سے رقیبوں کی اجازت سے ملا تھا
اتنی ہی سہولت سے گنوا بیٹھا میں اس کو
وہ شخص مجھے جتنی سہولت سے ملا تھا
میں اس کے لیے کیوں نہ دل و جان لٹاتا
وہ مجھ کو فقط عشق کی نسبت سے ملا تھا
چلتی نہ بھلا کیسے کوئی پھلجھڑی مجھ میں
شوخی سے ملا تھا وہ شرارت سے ملا تھا
اے ربِ سخن فضل ہو ایسا کہ ملے جو
وہ سب کو بتائے کہ میں شوکت سے ملا تھا

کیا کیا اُڑانے بھرتے ہیں پر کے بغیر بھی
کتنے سفر کیے ہیں سفر کے بغیر بھی
جس میں ترے علاوہ کوئی دوسرا نہ تھا
دیکھا ہے اک جہان نظر کے بغیر بھی
یہ کائنات لگتی ہے اپنا مکاں مجھے
گھر میں رہا ہوں میں سدا گھر کے بغیر بھی
ورنہ تو اپنے آپ سے وحشت سی ہے مجھے
نیکی کا کام کرتا ہوں ڈر کے بغیر بھی
یہ معجزے بھی اس کی محبت میں ہو گئے
شہکار کچھ تراشے ہنر کے بغیر بھی
ہر خاص و عام ملتے ہیں درویش سے جہاں
دربار کچھ تو ہوتے ہیں در کے بغیر بھی
شوکت کسی بھی گھر میں جو ماں کا وجود ہو
رہتی ہے اس میں چھاؤں شجر کے بغیر بھی

مشکل کسی طرح تو مری حل کرے کوئی
دیوانہ ہو چکا ہوں میں پاگل کرے کوئی
بوندیں تو میری پیاس بڑھاتی ہیں اور بھی
صحرا مزاج ہوں مجھے جل تھل کرے کوئی
خالی پڑا ہوں میں کسی گلدان کی طرح
مجھ میں سما کے مجھ کو مکمل کرے کوئی
بچپن گزارا میں نے کڑی دھوپ میں بہت
چہرے پہ اب تو پیار کا آنچل کرے کوئی
گاڑی چلا رہا ہوں محبت کی آج کل
محتاط مجھ کو نیند سے ہر پل کرے کوئی
شوکت زمیں پہ دھول کی صورت رہا ہوں میں
اب آسمان پر ہوں سو بادل کرے کوئی

آنسو تھا اس کی یاد میں دریا بنا رہا
اس کا کرم ہوا تو میں ایسا بنا رہا
میرے تو اختیار میں بننا تھا اس لیے
جیسا بنایا اُس نے میں ویسا بنا رہا
ورنہ مرا وجود ازل سے ہی برف تھا
میں تو کسی کے چھونے سے شعلہ بنا رہا
میرے علاوہ کوئی نہیں تھا جہان میں
اپنے ہی درمیان تماشا بنا رہا
مجھ پر ستارے ٹوٹ کے گرتے رہے سبھی
شاید فلک کے واسطے خطرہ بنا رہا

CS CamScanner

بقیہ انٹرویو: ڈاکٹر اشفاق احمد ورک

ارژنگ:۔ آپ مقبول مزاح نگار ہیں، کالم نویس اور شاعر ہیں، نقاد، خاکہ نویس اور دیگر اصناف سخن میں بھی تخلیقی کام کیا ہے، ان اصناف میں سے دل کے زیادہ قریب کون سی صنف ادب ہے؟

ڈاکٹر اشفاق احمد ورک:۔ میری اب تک دو درجن سے زائد کتب مختلف ادبی اصناف پر شائع ہو چکی ہیں، اس کے علاوہ مستقل کالم نگاری بھی ربع صدی سے جاری ہے مگر میری پسندیدہ صنف سخن مزاح ہے۔ چونکہ مزاح نگاری کو مشکل صنفِ ادب سمجھا جاتا ہے۔ میں نے ایک جگہ لکھا تھا کہ مزاح نگاری معاشرے میں گری پڑی جزیات کو پلکوں سے اٹھا کر ہونٹوں پر سجانے کے عمل کا نام ہے۔ مزاح تحریر کرتے ہوئے مجھے بہت مزہ آتا ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے میں ہوم گراؤنڈ پر کھیل رہا ہوں۔ اس کے علاوہ خاکہ نگاری مجھے بہت محبوب ہے۔ خاکہ لکھتے ہوئے میری دانست میں حواس ہشتہ درکار ہوتے ہیں۔ اس میں کامن سینس، سینس آف ہیومر اور جمالیاتی حس کو بھی شامل کر لیں تو حواسِ خمسہ سے جب یہ حواس ملتے ہیں تو ہی اعلیٰ درجے کا مزاح تخلیق پاتا ہے۔ حواس ہشتہ سے کسی شخص کی روح نچوڑ لینے کا نام ہے خاکہ نگاری۔ میں نے اپنے دوستوں، محبوب شخصیات اور فرضی کرداروں کے علاوہ مہینوں تک کے خاکے تحریر کئے ہیں۔ مزاح نگاری ایک صنفِ سخن سے زیادہ ایک رویہ، ایک ہتھیار اور سہارا ہے جو چیزوں کو خوشگوار بناتا ہے۔

ارژنگ:۔ ادب وصحافت سے شوق کی ابتداء کیسے ہوئی؟

ڈاکٹر اشفاق احمد ورک:۔ صحافت سے تعلق کی ابتداء تو بادلِ نخواستہ یوں ہوئی کہ 1997 میں روزنامہ دن ایک بڑے اخبار کی صورت میں شائع ہونا شروع ہوا۔ اس کے مدیر ہاجرہ مسرور کے بھائی توصیف احمد خان تھے۔ انہوں نے کالم لکھنے کی دعوت دی تو میں نے یہ صحافتی سفر شروع کر دیا۔ وجہ شاید یہ بھی تھی کہ اخبار میں لکھا ہوا اپنا نام بچپن سے بھلا لگتا تھا، یہ پڑھ کر خوشی اور انجانی سی طمانیت محسوس ہوتی تھی۔ پھر نوائے وقت اور آج کل 92 نیوز میں لکھ رہا ہوں اس کی وجہ شوق بھی ہے، چونکہ ادیب اسی معاشرے کا حصہ ہوتا ہے، وہ جو محسوس کرتا ہے اسے قلم کی زبان سے لوگوں تک پہنچانے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ کالم نگاری باقاعدہ ادب کا حصہ نہیں ہے۔ مگر یہ اپنے عہد کی تاریخ ہے۔ ہمارے اردگرد آج جو کچھ بھی ہو رہا ہے وہ اخبارات کے کالموں کے ذریعے تاریخ کا حصہ بن رہا ہے، اگر گزشتہ ماہ سال کی تاریخ جاننا چاہیں تو یہی کالم مستند ترین تاریخی حوالہ ہیں جن کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ جہاں تک ادب کا تعلق ہے تو شاید وہ بچپن سے ہی طبیعت کی موزونیت کی صورت میں میری دلچسپی کا سبب رہا اور ہمیشہ ہی حرفوں سے ایک رومانوی تعلق محسوس کیا ہے۔ جن دنوں میں ایم اے کرنے پنجاب یونیورسٹی میں آیا تو سالانہ تقریب میں مجھے اپنا ایک مزاحیہ مضمون ''آج جمعرات ہے'' پیش کرنے کا موقع ملا۔

یونیورسٹی کے طلباء کی کثیر تعداد کے علاوہ اس تقریب میں ڈاکٹر خواجہ محمد ذکریا، رفیع الدین ہاشمی، سہیل احمد خان کے علاوہ سجاد باقر رضوی جیسے مستند ادیب اور اساتذہ شریک تھے۔ سب لوگوں نے مجھے بہت داد دی۔ بلکہ سجاد باقر رضوی نے تو مجھے اپنے دفتر میں بلا کر چائے پلائی اور وعدہ لیا کہ دسمبر کی چھٹیوں میں ایسا ہی ایک اور مضمون لاؤ گے۔ اس کے بعد میں نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا اور لکھتا ہی رہا۔ آغازِ سخن تو کالج کے ابتدائی دنوں میں ہی ہو گیا تھا مگر باقاعدہ سنجیدگی سے ایم اے کے دوران بزم ادب کی مذکورہ تقریب ہی قرار دوں گا۔

ارژنگ:۔ اہل قلم کو سیاست میں حصہ لینا چاہیئے یا نہیں؟

ڈاکٹر اشفاق احمد ورک:۔ ادیب معاشرے کا سب سے حساس طبقہ ہیں۔ سیاست اور مذہب کے متعلق ان کی رائے بھی ہوتی ہے اور جذبات و احساسات بھی موجود ہوتے ہیں مگر میں کسی سیاسی جماعت میں شمولیت اختیار کرنے کے حق میں نہیں ہوں۔ بفرض محال اگر حالات اس طرح کے پیدا ہو جائیں کہ وہ کسی سیاسی جماعت کا حصہ بن بھی جائیں تب بھی، اپنے سیاسی قائد کا جس طرح وہ دفاع کر رہے ہوتے ہیں وہ قابل قبول نہیں۔ میں نے لکھا تھا کہ

صحافی سے بنتا ہے کیسے صحافہ
فافہ، لفافہ، لفافہ، لفافہ

کسی زمانے میں جن صحافیوں کے کالمز لوگ محفلوں میں بطور دلیل پیش کیا کرتے تھے آج ان کے شرمناک کردار کو دیکھ کر افسوس ہوتا ہے، پتہ نہیں انہیں اللہ تعالیٰ کے رازق ہونے پر یقین نہیں ہے یا پھر لالچ کی ہر حد کو عبور کر چکے ہیں یہ لوگ۔

ارژنگ:۔ کبھی کسی ادبی تحریک کا بھی حصہ رہے ہیں؟

ڈاکٹر اشفاق احمد ورک:۔ میں نے پاکستان کی تمام ادبی تحریکوں کو بڑے قریب سے دیکھا ہے۔ بائیں بازو، دائیں بازو کی ادبی تنظیمیں، ترقی پسند، اسلامی ادب، میں نے جب ان تحریکوں کو قریب سے دیکھا تو میرا ان سے ایمان ہی اٹھ گیا۔ یہ لوگوں کے اپنے

CamScanner

اپنے ہتھیار ہیں۔ وہ کسی سے سوال کیا گیا، شاید ان کی داڑھی دیکھ کر کہ آپ کا تعلق جماعت اسلامی سے ہے؟ تو جواب آیا کہ نہیں میرا جماعت اسلام سے تعلق ہے۔ میرا بھی کسی ادبی تحریک سے نہیں، ادب سے تعلق ہے۔ ایسا نہیں کہ میں کسی کو ناپسند کرتا ہوں، میری نظر میں اس سے ادب متاثر ہوا ہے۔ مجھے پچھلی نشستوں پر بطور سامع بیٹھنا اچھا لگتا ہے۔ میں گوشہ نشین آدمی ہوں۔ مشاعروں کی بات کی جائے تو آج کل مشاعرہ اداکاری کا نام ہے، اپنی اس طبیعت کے ساتھ میں شائد کسی ادبی تحریک کا حصہ بن ہی نہیں سکتا، میں پینڈو سا آدمی ہوں اور اس پینڈو ہونے پر مجھے یقین کریں بڑا فخر ہے۔

ارژنگ: تخلیقیت کیا ہے؟ ایک اچھے تخلیق کار سے آپ کیا مراد لیتے ہیں؟

ڈاکٹر اشفاق احمد ورک: تخلیق بڑی خوبصورت چیز ہے۔ اللہ تعالیٰ خود خالق ہے اور اس نے ہمیں بھی یہ وصف عطا کیا ہے کہ ہم تخلیق کر سکیں۔ اچھا شعر تو ہوتا ہے وہ ہے جس کی گونج صدیوں تک سنائی دے۔ ہم آج بھی یہ کہتے ہیں کہ

ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

تخلیق ہی ادب کا حسن ہے۔ جو عدم کو وجود میں لا کر سرشار کر دیتی ہے۔ مجھے افسوس ہوتا ہے جب میرے معاصر ادیب کرسیوں اور چھوٹے چھوٹے مفادات کے لئے دھکے کھاتے پھرتے ہیں، اپنی انا تک کی پرواہ نہیں کرتے۔ اس دور میں خود کو نیوٹرل رکھنا بہت مشکل ہے۔ ادیب تخلیقی عمل کو پس پشت ڈال کر لڑائیوں میں مشغول رہنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔

ارژنگ: کوئی بے حد آسودہ وقت؟ تخلیقی سطح پر بھی اور زندگی کی سطح پر بھی؟

ڈاکٹر اشفاق احمد ورک: میں نے بڑا مشکل وقت گزارا ہے۔ بچپن یتیمی میں گزرا۔ اسکول جانے کے لئے بھی دس دس کلومیٹر پیدل چلنا۔ ایم اے تک تو میرے پاس سائیکل بھی نہیں تھی۔ زمینیں تھیں مگر انہیں دیکھنا بھالنا ایک بیوہ عورت کے لئے آسان نہیں تھا۔ میری والدہ نے 48 سال بیوگی کاٹی ہے 2014ء میں فوت ہوئیں۔ میں تو ان کی ہمت، استقامت اور صبر کو سلام کرتا ہوں جیسے انہوں نے اپنے پروں تلے ہمیں محفوظ رکھا۔

1989ء میں مجھے لیکچرار کی نوکری ملی اور اگلے سال میں نے سیکنڈ ہینڈ موٹر سائیکل خریدی جس پر انیس سال نوکری کی ہے۔ کبھی بھی مگر محرومی محسوس نہیں کی ہے۔ اب تو لاہور میں اپنا گھر ہے، گاڑی بھی ہے، سب کچھ ہے۔ کتاب پڑھنا میرے لئے سب سے بڑی عیاشی ہے۔ لکھتے رہنا میرا کام بھی ہے اور تفریح بھی ہے۔ مطالعے کے بغیر تو مجھے نیند نہیں آتی ہے۔

یتیم ہونے کی بات کروں تو یتیم ہونا میرے نبیؐ کی سنت ہے۔ بڑا مشکل جملہ ہے مگر میں کہوں گا کہ یتیم ہونے نے میرے لئے زندگی آسان بنا دی۔ یہ دکھ اس قدر بڑا اور شدید تھا کہ اس کے سامنے کوئی پریشانی پریشانی نہیں لگتی تھی، ہر مشکل اس کے سامنے ہیچ تھی۔ وہ کہتے ہیں نا کہ زمانے بھر کے غم یا اک تیرا غم، وہی کیفیت تھی کہ سارے غم ہی اس غم کے نیچے دب گئے۔ آج میں دیکھتا ہوں کہ جن کے باپ زندہ تھے وہ وہیں کے وہیں رہ گئے، لاڈ پیار میں، سکول سے آگے نہیں گئے وہ سارے دوست، میں پہلا کالج میں جانے والا، پہلا ایم اے کرنے والا، پہلا لیکچرار اور پہلا پی ایچ ڈی ہوں، اپنی کلاس کے طالب علموں میں سے صاحب کتاب تو اور کوئی بھی نہیں ہے۔ مشکلات جس طرح انسان کو حساس بناتی ہیں عیش و عشرت میں پلے بچے اس سے محروم رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ گاڑیاں، بنگلے ہونے کے باوجود ان کے چہروں پر وہ طمانیت نظر نہیں آتی ہے۔

ارژنگ: عملی زندگی کا آغاز کب اور کہاں سے کیا؟

ڈاکٹر اشفاق احمد ورک: جیسے ہی میں نے پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے اردو کیا تو مجھے لیکچرار کی نوکری مل گئی۔ میں ان دنوں فارسی میں ایم اے کر رہا تھا جب مجھے فیڈرل کالج سیالکوٹ میں نوکری ملی۔ یہ سال 1989 تھا۔ چند برس بعد شادی ہوئی۔ چار بچے ہیں الحمدللہ، ان میں سے تین کی شادی ہوگئی ہے، دو جاپان میں ہیں، ایک اسلام آباد اور ایک ہمارے ساتھ۔

ارژنگ: کسی لکھاری کو لکھنے کی تحریک کہاں سے ملتی ہے؟ معاشرے سے یا پھر اندرون سے؟

ڈاکٹر اشفاق احمد ورک: مشاہدہ، تجربہ، تخیل جب یہ تین چیزیں ملتی ہیں تو معیاری تخلیق وجود پاتی ہے۔ معاشرہ اور اندرون دونوں ہی اہم ہیں۔ تخیل بڑا ہی اہم ستون ہے تخلیق کے لئے۔

ارژنگ: آپ نے طویل عرصہ تدریس کے شعبے میں گزارا ہے، یہ کیسا تجربہ رہا؟

ڈاکٹر اشفاق احمد ورک: تدریس میرا عشق ہے۔ پڑھا کر مجھے جو طمانیت محسوس ہوتی ہے وہ کسی اور کام میں نہیں اگر مجھے ایک اور زندگی ملے تب بھی میں پڑھانا ہی پسند کروں گا۔ عمر عزیز کے 34 سال اس شعبے میں گزارے اور محبت میں گرفتار ہو کر پڑھایا ہے، مجبوری سے نہیں۔

ارژنگ: آج کل کیا لکھ رہے ہیں؟ مستقبل کے کیا منصوبے اور ارادے ہیں؟

ڈاکٹر اشفاق احمد ورک: آج کل میں اپنی آپ بیتی لکھ رہا ہوں ''سو صفحے کی زندگی''، مختصر سی ہے۔ میں اپنے بچوں کو اپنی CV دکھاتے ہوئے کہا کرتا ہوں کہ یہ آپ پر رعب ڈالنے کے لئے نہیں ہے۔ بلکہ یہ بتانے کے لئے ہے کہ ایک یتیم بچہ اس وقت پی ایچ

ڈی بہت ہی مشکل حالات میں کرلیتا ہے، جب پورے ضلع شیخوپورہ اور ضلع ننکانہ صاحب میں ایک بھی پی ایچ ڈی نہیں تھا، اس لئے کوئی بھی کام مشکل نہیں ہے۔ اس کے علاوہ اردو ادب کی مختصر تاریخ لکھ رہا ہوں جو دو سو صفحات پر مشتمل ہوگی، بنیادی نقطہ یہ ہے کہ ادب کا طالب علم ایک رات میں اگر چاہے تو مکمل طور پر پڑھ لے۔

ارژنگ:۔ کیا یہ تاثر درست ہے کہ الیکٹرانک میڈیا کی وجہ سے کتاب سے دوری پیدا ہوگئی ہے؟

ڈاکٹر اشفاق احمد ورک:۔ الیکٹرانک میڈیا تو پوری دنیا میں ہے۔ مگر وہاں کتاب ختم تو نہیں ہوئی ہے، اور نہ ہی مطالعہ کا ذوق ماند پڑا ہے۔ ہمارے ملک میں کتاب سے دوری کا سبب نالائق حکومتیں بھی ہیں جن کی ترجیحات میں مطالعے کو فروغ دینا نہیں ہے۔ میری نظر میں تو کتاب کا ذائقہ دنیا کا سب سے مزیدار ذائقہ ہے۔ باقی چیزیں تو جزو بدن نہیں بنتی مگر کتاب ہمیشہ کے لئے آپ کی یاداشت اور مزاج کا حصہ بن جاتی ہے۔ آج بھی اگر حکمران طبقے کے ہاتھ میں کہیں کہیں کوئی معیاری کتاب نظر آجائے کسی تقریب میں اور کسی تقریر میں کوئی ادبی جملہ اور شعر پڑھا جائے تو اس سے منظر نامہ بہت بہتر ہوسکتا ہے۔ ہمارے ہاں تعلیم کا بجٹ بہت کم اور لائبریریوں کا بجٹ تو نہ ہونے کے برابر ہے۔ پوری دنیا میں لائبریریاں انسان بناتی ہیں اور وہ لطف اندوز ہونے کے لئے سب سے بہتر جگہیں شمار کی جاتی ہیں۔ ہم نے لطف اندوز ہونے کے لئے غلط جگہیں چن لی ہیں۔ میں نے زندگی کے تمام ذائقے چکھے ہیں اور مطالعے کا ذائقہ سب سے بہتر لگا ہے الیکٹرانک میڈیا کو تو کتاب ترویج کے لئے بھی استعمال کیا جاسکتا ہے۔

❀❀❀

کیوٹو یونیورسٹی اور سمی ٹوموکمپنی کے جنگلات کے تعاون سے
جاپان میں لکڑی کے خلائی سیٹلائٹ

ڈاکٹر عبدالرحمٰن صدیقی/ٹوکیو، جاپان

جاپان میں کیوٹو یونیورسٹی قائم شدہ 1897ء اور جاپان کی مشہور تجارتی کمپنی سمی ٹوموکے جنگلات کے تعاون سے دنیا میں پہلی بار لکڑی کاٹھ سے تیار ہونے والے ایک سیٹلائٹ خلائی جہاز (Lignosat) لگنوسیٹ کی تیاری کا اعلان کیا ہے۔ یہ ایک عجوبہ ہوگا۔ لگنوسیٹ کو فلوریڈا کے کینیڈی اسپیس سنٹر سے روانہ کیا جائے گا۔ ارادہ ہے کہ یہ تجرباتی جہاز K180 (کیبو) ماہ ستمبر، اکتوبر 2024ء میں روانہ کیا جائے گا۔ یہ ہنگامہ خیز ہے۔ اس لگنوسیٹ کی تیاری 2020ء سے جاری تھی۔ اسے ایک خاص درخت Magnolia میگنولیا سے تیار کیا گیا ہے۔ اس سے قبل اس خاص لکڑی کے خصوں کو ساکورا، برچ اور دوسرے جنگلاتی درختوں کے ساتھ آزمایا گیا ہے اور میگنولیا کو سمی ٹوموکے خصوصی جنگل میں سب سے مضبوط اور مناسب ترین پایا گیا۔ یہ حسن اتفاق ہے۔ اس تجرباتی جہاز کو 10 دس کیوبک سینٹی میٹر کا بنایا گیا ہے۔ اس کی تیاری میں اس خصوصی طریقہ کو استعمال کیا گیا ہے جس میں کوئی دھات کا اسکریو، کیل، کانٹا، پن یا گوند، بانڈ نہیں استعمال ہوتا۔ اس کے لیے خصوصی شمسی توانائی استعمال کی جارہی ہے۔ غرضیکہ جاپان ایک نیا تجربہ کررہا ہے۔ جبکہ عام طور پر یہ طریقہ کھلونے بنانے میں استعمال ہوتا ہے۔

تجربات سے واضح ہوا ہے کہ لکڑی کا یہ سٹلائٹ اس میں سوار شخص پر صنعتی خوبیوں اور مطالعاتی اوزاروں پر مضر اثر نہیں ڈالے گا اور تکنیکی احکامات کی بھی پابندی میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔ اس منصوبہ کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ خلاؤں میں فضول کوڑا کرکٹ جمع نہ ہو اور ماحولیاتی بین الاقوامی خلائی قوانین کی بھی پابندی کی جائے۔ عام طور پر خلائی جہازوں کے تباہ کیے جانے کے بعد فضاؤں میں دھاتوں کے ذرات ماحول کو نقصان دہ اور مضر صحت بنا دیتے ہیں۔ جبکہ کاٹھ یا خاص لکڑی کا یہ لگنو سیٹ (Lignosat) اس عیب سے پاک ہوگا۔

خاص اور اہم بات یہ ہے کہ اس خاص قسم کی لکڑی مسلسل حاصل کی جاسکتی ہے یا نہیں؟ کیوٹو یونیورسٹی کے اس پروجیکٹ کے سربراہ ماہر خلا باز پروفیسر (Tokao Doi) تاکا کودوئی کا کہنا ہے کہ ہم طویل مدت کے منصوبہ میں چاند اور مشتری سیاروں میں انسان کو بھی لکڑی کے مکانوں میں آباد دیکھنا چاہتے ہیں۔"

ابھی آئندہ چھ ماہ میں درجہ حرارت، لکڑی کا گھٹنا بڑھنا، ماحولیاتی اثرات، اوزاروں پر اثرات، مصنوعی آلات پر اثرات کا جائزہ لیا جارہا ہے اور یہ ایک طرح کی تجربہ گاہ بھی ہے۔ لگنوسیٹ (Lignosat-1) سے حاصل شدہ تجربات (Lignosat-2) کے لیے استعمال کرنے کا پروگرام تیار کیا جارہا ہے۔ دوسری طرف سمی ٹوموکے جنگل کا شعبہ لکڑی کے گرم یا خشک ہونے، تر ہونے، ٹوٹنے، درجہ حرارت کی برداشت اور خاص طور پر Nanolever پر تجربہ کررہی ہے۔ تاکہ اس خاص لکڑی کے دوسرے تعمیراتی، بیرونی استعمال بھی دریافت کیے جائیں۔

(حوالہ: دی جاپان ٹائمز، 31 مئی 2024ء)

ڈاکٹر رشید امجد کی باقاعدہ شاگردی میرے لیے اعزاز کی بات ہے اور یوسف حسن کی محفل میں بیٹھنے کی سعادت حاصل ہے جس سے ترقی پسندی کو سمجھنے کا موقع ملا۔ مجھے تمام اہم نظم نگاروں کی رفاقت اور دوستی میسر رہی جن میں خاص طور پر فرخ یار، ڈاکٹر کوثر محمود (مرحوم)، ثاقب ندیم، فہیم شناس کاظمی، جاوید فیروز، وحید احمد، پروین طاہر، گلناز کوثر دیگر شعرا و ادبا میں مجھے محمد عاصم بٹ، حبیب چودھری، مقصود وفا، عابد سیال اور خاص طور پر عمران عامی کی رفاقت نصیب ہوئی۔

1989 میں پہلی بار اوراق میں نظم شائع ہوئی اس کے بعد تواتر سے اوراق، تسطیر، فنون، ادبیات، نقاط، تادیب، تجدید نو، دستاویز وغیرہ میں نظمیں شائع ہوتی رہیں۔

میری پہلا نظمیہ مجموعہ " کتھا نیلے پانی کی"
2006 میں شائع ہوا دوسرا نظمیہ مجموعہ
"دوستوں کے درمیاں" 2019 میں اشاعت پزیر ہوا یہ دونوں مجموعے آزاد نظم کے ہیں۔

آزاد نظم کے علاوہ نثری نظم اور کبھی کبھی غزل بھی کہہ لیتا ہوں۔

پاکستان کے موقر ادبی مجلوں میں میرے مختلف مضامین شائع ہوتے رہے ہیں۔ ایک درجن سے زائد ایچ ای سی کے منظور شدہ اردو تحقیقی جرائد میں مضامین شائع ہو چکے ہیں۔

پچیس سے زائد ایم ایس/ ایم فل اردو کے سکالرز کا نگران رہا ہوں اور دس پی ایچ ڈی کے مقالوں کے نگران کی حیثیت سے فرائض سرانجام دیئے ہیں یہ سلسلہ ابھی جاری ہے دیگر یونیورسٹیوں کے بیسیوں ایم فل/ پی ایچ ڈی کے مقالات کو بیرونی ممتحن کے طور پر جانچا ہے۔ قومی سطح کی بیسیوں کانفرنسوں اور سیمینارز میں شرکت کی ہے اور مقالات پیش کیے ہیں۔

2۔ کیا شاعری کی کوئی تعریف متعین کی جا سکتی ہے؟

جواب: یوں تو شاعری کی عمومی تعریف کلام موزوں کی جاتی ہے۔ لیکن یہ کافی نہیں۔ شاعری حیات کے ساتھ ساتھ فکر و خیال، جذبہ و احساس، داخل و خارج، شعور و لاشعور، ادراک و وجدان کا ایسا اظہار ہے جو پڑھنے والے میں ترفع پیدا کرے۔ شاعری ایک سرگوشی ہے جو بعض اوقات چیخ بن جاتی ہے بعض اوقات نوحہ بعض اوقات حیات و کائنات کے متوازی ایک حیات و کائنات کا تصور (بڑی شاعری تب ہی جنم لیتی ہے)

3۔ آپ نقاد بھی ہیں آج کے ناقدین کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب۔ میں باقاعدہ نقاد نہیں بنیادی طور پر شاعر ہوں جس طرح تخلیقی فن پارے ہے یا جیسا ہونا چاہیے اس پر بات کرتا رہتا ہوں۔ ادب ایک ادق ذریعہ اظہار ہے اور تنقید اس کی تفہیم تشریح حسن و قباح کے بیان کا نام ہے۔ تنقید تخلیق کے بے مہابا بہتے ہوئے دریا کے کنارے متعین کر کے اسے ایک رخ میں بہنے کا طریقہ بھی سکھاتی ہے اور موجود بہاو کے اسباب و علل پر بھی بات کرتی ہے۔ ماضی میں مختلف نظریاتی بنیادوں پر ادب آرٹ میں مختلف تحریکیں کارفرما رہیں جن کے سبب ان خاص پیمانوں کو مدنظر رکھ کر فن پارے کی تفہیم کی جاتی رہی لیکن ان تحریکوں کے زوال کے بعد کوئی خاص تنقیدی نقطہ نظر رائج نہیں رہا سوائے مابعد جدیدیت کے۔ مابعد جدیدیت کے الگ مسائل ہیں۔ وہ اس سے مکالمہ نہیں کرتی کہ تخلیقی فن پارے کو کیسا ہونا چاہیے یا یہ کہ کسی بڑے تخلیقی فن پارے میں کون سے خصائص ہوتے ہیں۔ وہ متن سے معنی کی کثرت تلاش کرتی ہے اور مصنف کو ایک ذریعہ مانتی ہے۔ لیکن فن پارہ بنا سیاق و سباق کے نہیں ہوتا۔ منشائے مصنف بھی کوئی شے ہوتی ہے۔

جہاں تک تعلق معاصر تنقید کا ہے تو معدودے چند مابعد جدید ناقدین کے کوئی اہم ناقد منظر پر نہیں۔ یہ مسئلہ اردو ادب کو 60 کی دہائی کے بعد سے درپیش ہے۔ جزوی طور پر تو تنقیدی و تحقیقی کام ہو رہا ہے۔ بے شمار جامعات میں ہزاروں مقالات سندی تحقیق کے لیے لکھے جا چکے ہیں۔ ادب کے اساتذہ مختلف جرنلز میں مقالے لکھ رہے ہیں لیکن 1970 تا حال کوئی مربوط تاریخ اور اصناف ادب کا بھرپور تنقیدی مطالعہ، رجحانات، اسباب و علل پر کسی بھی نقاد نے کچھ نہیں لکھا۔ یہ بہت بڑا خلا ہے جسے پر کرنے کی اشد ضرورت ہے تا کہ ادب کے مجموعی مطالعہ کے ذریعے معاشرتی اقدار اور بدلتے ہوئے منظر نامے سماجی صورتحال کا زیرک نظری سے جائزہ لیا جا سکے۔

4۔ نقاد کا کردار کس قدر اہم ہے اور ایک نقاد پر کیا ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں؟

جواب: ادب میں نقاد کا کردار اہم ہے۔ جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا کہ نقاد کھرے کھوٹے کی پہچان کرواتا ہے۔ قاری اور تخلیق کار کے درمیان ایک پل کا کام سرانجام دیتا ہے۔ فن پارے کی تفہیم و تشریح کے ذریعے اس کی قدر و منزلت قائم کرتا ہے۔ ایسا

CamScanner

کرنے سے آئندگان کو ادب عالیہ کے جملہ خصائص سے آگہی ہوتی ہے اور وہ اس روش پر سفر کرتے ہیں۔ نقاد مختلف علوم کا ماہر ہوتا ہے اور وہ فن پارے کی تفہیم میں جملہ علوم سے مدد لیتا ہے اور اس کی پوشیدہ معنوی پرتیں عیاں کرتا ہے۔ جب کسی عہد پر بات کرتا ہے تو مجموعی ادب کے مطالعہ سے اقدار اور مسائل کا تعین کرتا ہے۔ یہ تمام کام ایک نقاد ایک انتہائی ذمہ دار ادیب کے طور پر کرتا ہے۔ اس لیے اسے ذاتی پسند نا پسند اور عصبیتوں سے بالاتر ہونا پڑتا ہے۔ کیوں کہ وہ اپنی تنقید اور تجزیات کے ذریعے ہواوں کا رخ بتا رہا ہوں ہے جس پر آئندگان انحصار کرتے ہیں اس لیے نقاد کو تمام تر ادب کے ذریعے سماج میں ہونے والی تبدیلیوں کو بیان میں لانے کی ذمہ داریاں نبھانا ہوتی ہیں۔ یوں نقاد ادب اور سماج کا ایک اہم رکن بن جاتا ہے

5۔ کیا مشاعرے شعر و ادب کے فروغ کے لئے ضروری ہیں، آپ کی نظر میں مشاعروں کی کیا اہمیت ہے؟

جواب: مشاعرے ہماری ثقافتی پہچان ہیں۔ یہ ادارہ ادب کی سماجیات کی ذیل میں آتا ہے۔ ایک مشاعرے میں بیس شعرا کو سنیں آپ کو کسی کا ایک شعر یا مصرع یاد رہ جائے گا۔ مجموعی طور پر آپ اس ادبی فضا سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں لیکن مشاعروں سے سنجیدہ رائے قائم نہیں کی جا سکتی۔ یہ ایک پلیٹ فارم ضرور ہے لیکن جس قدر شعر و ادب کے فروغ میں کتاب کا کردار اہم ہے مشاعرے کا نہیں۔

6۔ نئے لکھنے والوں میں کس کو پسند کرتے ہیں اور قدیم شعراء میں آپ کو کون پسند ہے؟

جواب: مجھے کلاسیکی شعرا میں سب سے زیادہ میر تقی میر پسند ہیں پھر غالب۔ نظم نگاروں میں راشد، میرا جی، فیض، مجید امجد، اختر حسین جعفری۔

نئے لکھنے والوں کی فہرست بہت طویل ہے۔

غزل میں ناصر کاظمی، فراز، ثروت حسین، ظفر اقبال، جلیل عالی، شکیب جلالی، یوسف حسن، جمال احسانی، صابر ظفر، انور شعور، مقصود وفا، انجم سلیمی، طارق نعیم، افضل گوہر، قمر رضا شہزاد، شاہین عباس، افضل گوہر، رانا سعید دوشی، احمد رضوان، رحمان حفیظ، ادریس بابر، عابد سیال، منیر فیاض، عمران عامی، قیصر منور، کاشف حسین غائر، دلاور علی آذر، فقیہہ حیدر، سعید شارق، مصور عباس (کچھ نام بھول رہا ہوں گا معذرت)

نظم میں مجھے سرمد صہبائی، جاوید انور، وحید احمد، نصیر احمد ناصر، علی محمد فرشی، رفیق سندیلوی، انوار فطرت، ابرار احمد، فرخ یار، ثاقب ندیم، حسین عابد، جمیل الرحمان، افتخار بخاری، داود رضوان، سعید احمد، فہیم شناس کاظمی، تابش کمال، پروین طاہر، دانیال طریر، جاوید فیروز، خلیق الرحمٰن، قاسم یعقوب، سرمد سروش، قندیل بدر، ذیشان حیدر، عمران ازفر، سلمان ثروت، گلناز کوثر، فاخرہ نورین پسند ہیں۔

(جو نام بھول رہا ان کے لیے معذرت)

نثری نظم میں مجھے ثاقب ندیم، جمیل الرحمٰن، حسین عابد، پروین طاہر، علی محمد فرشی، نصیر احمد ناصر، افتخار بخاری، سلیم شہزاد، کاشف رضا۔ سلمان حیدر، سدرہ سحر عمران، ارشد احمد (جہلم)، زاہد امروز، منزہ احتشام گوندل، انجیل صحیفہ سدرہ افضل پسند ہیں۔

جو نام بھول رہا ان کے لیے معذرت)

7۔ کیا شاعری میں جدت طرازی تازہ ہوا کا جھونکا ہے یا اس نے ادب کے اصل چہرے کو کسی حد تک مسخ کیا ہے؟

جواب: شاعری ہے ہی جدت طرازی کا نام ورنہ کون سا ایسا موضوع ہے جس پر شعر نہ کہا گیا ہو یا نظم نہ لکھی گئی ہو۔

سیف انداز بیان رنگ بدل دیتا
ورنہ دنیا میں کوئی بات نئی بات نہیں

انداز بیاں بدلنا ہی جدت ہے۔ لیکن جدت کے نام پر بے سروپا تجربے کرنا اور انحراف کی ایسی صورتیں پیدا کرنا جس سے اچھی تخلیق وجود میں نہ آتی ہو جدت نہیں بلکہ پھونڈی چال ہے۔ جس سے شعر و ادب کا چہرہ مسخ ہوتا ہے۔ جدت کا تقاضا یہ ہے کہ روایت کے اندر رہتے ہوئے مختلف انداز کو اپنا کر نیا راستہ نیا مضمون تراشا جائے۔ روایت سے انحراف بھی معنی رکھتا ہے لیکن اس کے لیے بڑے تجربے کی ضرورت ہے۔ بڑے ذہن کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہمارے ادبی ورثہ میں بہت سے شعرا نے انحراف کیا غالب اور راشد اس کی بہترین مثالیں ہیں لیکن یہ بڑے تخلیق کار تھے۔

دوسری طرف اگر دیکھا جائے تو نظم میں بہت جدت آئی معاصر نظم نے سب سے زیادہ اسلوب اور ڈکشن کی سطح پر اور نظم کی تکنیک میں بہت سے نئے تجربے کیے ان تمام تر تبدیلیوں نے نظم کے دائرے کو وسعت دی نئی تکنیک نیا اسلوب نیا ڈکشن اس عہد کی پہچان بنا اور خاص طور پر راولپنڈی/اسلام آباد سکول آف پوئم نے اس صنف کو ترفع دیا۔

8۔ ہماری نئی نسل ادب سے کس حد تک دور ہو چکی ہے؟ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ سوشل میڈیا نے نئی نسل کو ادب سے دور کر دیا ہے؟

جواب: نئی نسل ادب تو کیا اپنی تمام سابقہ روایات و اقدار سے یکسر دور ہو گئی ہے۔ سائبر ایج میں پیدا ہونے والے بے شمار ذہنی و نفسیاتی، جسمانی و سماجی مسائل کا شکار ہیں۔ ان میں اجتماعیت کا فقدان ہے۔ یہ مجلس کے انسان نہیں رہے۔ یہ گفتگو میں متحرک نہیں ہیں۔ ہر بچہ اپنی دنیا الگ سے اپنے موبائل ہر

بنائے بیٹھا ہے۔ اسے پاس بیٹھے والدین سے غرض نہیں وہ اپنے موبائل میں غرق ہے وہ قریب بیٹھے ہوؤں سے گفتگو نہیں کرتا بلکہ دور بیٹھے کسی انجان سے محو کلام ہے۔ یہ تنہائی کی ایک خوفناک شکل ہے جس میں دنیا کے تمام تر نوجوان مبتلا ہیں جس کے سبب ذہنی و نفسیاتی عارضے جنم لے رہے ہیں۔ یہ سرمایہ دارانہ نظام ہے جنہوں نے یہ ایجاد کیا ہے انہیں اس بات سے غرض نہیں کہ اس سے نسل تباہ ہو رہی ہے انہیں صرف پیسے سے غرض ہے۔ اس امر میں ایک پہلو گیمنگ ٹیکنالوجی کا ہے آپ دیکھیں کہ کس طرح کی گیمز بنائی جا رہی ہیں جن میں قتل و غارت ہے بے رحمی ہے چوری کرنے کی ترغیب ہے اگر کار ریس سے تو قانون کی خلاف ورزی ہے اور پولیس پیچھا کرتی ہے تو اس پر فائر کرنا ہے، آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ ان گیمز اور سوشل میڈیا سے متشدد سائیکالوجی ابھر کر سامنے آ رہی ہے۔ احترام آدمیت نام کی کوئی نہیں۔ اختلاف کی بجائے مخالفت، گالم گلوچ اور ذاتیات پر حملے عام رواج پا چکے ہیں یہ ایسا بگاڑ ہے جس کے سدھار کی کوئی صورت نہیں۔ اس پر طرہ یہ کہ ایسی ایپس ہیں، جہاں نوجوان لڑکے لڑکیاں سر عام فحش گفتگو کرتے ہیں ان کے فالورز بڑھتے ہیں اور وہ پیسہ کماتے ہیں۔ موبائل ایک ایسا خطرناک آلہ ہے جس پر جو چاہیں آپ دیکھ سکتے ہیں بچے پورن سائٹ آسانی سے تلاش کرتے اور دیکھتے ہیں حالانکہ مغرب میں بھی 18 سال سے کم عمر کو دیکھنے کی اجازت نہیں لیکن یہ موبائل پر میسر ہے تو بچے کیسے محفوظ رہ سکتے ہیں۔ پھر سیاسی پارٹیوں نے سوشل میڈیا کا ایسا بھونڈا استعمال شروع کیا ہے کہ کسی کی عزت محفوظ نہیں۔ عدم برداشت بالکل ختم ہو چکی ہے اس پر کیا تبصرہ کریں۔

ہاں یہ ضرور ہوا ہے کہ سوشل میڈیا نے شعرا کو ایک پلیٹ فارم مہیا کر دیا ہے جس سے دور دراز کے شعرا بھی ایک دوسرے کو پہچاننے لگے ہیں۔ کلام سے آشنائی ہوتی ہے۔ مختلف فورمز پر سنجیدہ گفتگو بھی ہوتی ہے لیکن ٹک ٹاک اور انسٹاگرام نے ہلکی شاعری کو بھی فروغ دیا ہے جو جس قدر ٹک ٹاک پر مشہور ہے وہی بڑا شاعر ہے۔ جس کے سبب نوجوانوں میں سطحی شاعری کے فروغ اور سراہنے کا رجحان بڑھا ہے۔

دوسری طرف سوشل میڈیا ریاست کے متوازی ایک بیانیہ ہے جس پر ریاستی جبر کے قوانین لاگو نہیں ہوتے۔ یہاں افکار و خیالات کی آزادی ہے۔ آپ مختلف الرائے لوگوں کے خیالات سے آگاہ ہوتے ہیں۔

ماضی میں ادبی رسائل کے ذریعے معاصر ادب تک رسائی تھی مدیر ایک نقطہ نظر رکھتا تھا اور ادب کا گہرا شعور بھی وہ غیر معیاری تخلیقات کو شائع نہیں کرتا تھا یہ رسائل تربیت کا کام بھی کرتے تھے۔ اب ہر شاعر ادیب کو سہولت ہے کہ اس کا اپنا پیج ہے اس پر وہ معیاری و غیر معیاری کچھ بھی لکھ کر ڈال دیتا ہے اس کے کچھ دوست ہوتے ہیں جو تعریف کرتے ہیں شاعر خود کو بڑا شاعر تصور کر لیتا ہے۔ تربیت نام کی کوئی شے نہیں بزرگوں کے پاس بیٹھنا سیکھنا اور فن کے اسرار و رموز کو سمجھنا بالکل ناپید ہو گیا ہے بلکہ بزرگوں کی توہین کرنا اپنا فرض سمجھا جانے لگا ہے۔ ان کا کل مطالعہ کتاب کی بجائے گوگل ہے۔ اس پر نوحہ کناں ہی ہوا جا سکتا ہے یہ قوموں کے زوال کی علامت ہے۔

9۔ آپ کو لگتا ہے کہ موجودہ ادیب اور شاعر سماجی منافقت کا شکار ہو چکے ہیں؟

جواب: پورا معاشرہ ہی منافقت کا شکار ہے۔ شاعر ادیب اس سے باہر تو نہیں۔ سماجی سطح پر وہ بھی انسان ہیں۔ ہر تخلیق کار کی دو حیثیتیں ہوتی ہیں ایک سماجی اور دوسری تخلیقی۔ یہ دونوں الگ الگ ہیں۔ سماجی سطح پر وہ عام انسانوں جیسا ہے لیکن تخلیقی مراحل میں وہ مختلف ہو جاتا ہے۔ اگر سماج میں اقدار بری ہیں تو وہ بھی ایسا ہی ہوگا لیکن عظیم تخلیق کار کا سماجی و تخلیقی وژن ایک سا ہی ہوتا ہے اور وہ خال خال ہوتے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ تخلیق کار یوں بھی سماجی مروج اقدار سے منحرف ہوتا ہے وہ اپنا پیمانہ بناتا ہے اس لیے بھی سماج سے اس کا ٹکراؤ رہتا ہے۔

10۔ آپ نے شاعری میں نظم کا ہی انتخاب کیوں کیا جبکہ نظم ہمیشہ ایک متنازع موضوع رہی ہے؟

جواب: دنیا کی سب سے قدیم شاعری نظم ہے۔ ہومر کی اوڈیسی۔ نظم دنیا بھر میں سب سے زیادہ لکھی گئی ہے اور لکھی جا رہی ہے۔ نظم میں اظہار کی گنجائش زیادہ ہے۔ بات مکمل کہی جا سکتی ہے۔ زمانہ جس قدر پیچیدگی کا شکار ہے اس کا اظہار صرف نظم میں ہی ہو سکتا ہے۔ نظم کی بے شمار تکنیکس ہیں۔ نظم کا کینوس بہت وسیع ہے۔ اس لیے مجھے نظم کہنے میں سہولت ہے۔ جہاں تک بات متنازع ہونے کی ہے تو اب بھی نظم کو مشاعرہ باز شاعر شاعری نہیں سمجھتے یہ ان کے کمزور وژن کی علامت ہے ورنہ راشد، فیض، میرا جی، مجید امجد اور دیگر نظم نگاروں نے اردو شاعری کے دامن کو وسعت دی ہے۔

11۔ شاعری ایک عام شخص کی زندگی پر کس طرح اثر انداز ہوتی ہے؟ یا شاعری ایک مخصوص طبقہ کے لیے ہے؟

جواب: یوں تو شاعری ماضی میں اور اب بھی خواص کا مسئلہ رہی ہے۔ عوام میں صاحب ذوق کم ہی ہوتے ہیں انہیں روزی روٹی کے مسائل سے فرصت ہی نہیں ملتی وہ کیسے شاعری سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ شاعری رمز و کنایہ میں بات کرتی ہے وہاں تک رسائی عوامی سطح پر ممکن نہیں۔ ہاں ترقی پسند تحریک نے نچلے طبقات کے لیے شاعری کی اور ان کی آواز بنے،

CamScanner

وہ مقبول بھی ہوئے یہ ان کا contribution ہے۔ ساحر اور حبیب جالب اس قدر مقبول تھے کہ فیض بھی وہاں اعلیٰ شاعری کے باوجود نہیں پہنچ سکے۔

دوسری بات یہ کہ ماضی میں ہر پڑھے لکھے انسان کو شعر یاد ہوتے تھے وہ باتوں میں مثال شعر سے دیا کرتے تھے اس دور میں ریڈیو ٹی وی کی وبا نہیں تھی ہر گھر میں کتاب یا ادبی رسائل بچوں کے رسائل آتے تھے بھی پڑھتے تھے یہی انٹرٹیمنٹ بھی ہوا کرتی تھی۔ پھر ریڈیو اور ٹی وی نے یہ جگہ سنبھالی اور اب سوشل میڈیا نے۔ سو عوام کا براہ راست ادب سے واسطہ منقطع ہو گیا۔ اور ادب جو مزاحمتی، سماجی و سیاسی آگہی اور اقدار و روایات کے پرچار میں کردار ادا کرتا تھا محدود ہو کر رہ گیا۔ اس لیے شاعری یا ادب عام آدمی کا مسئلہ نہیں رہا۔

12۔ نثری نظم کا مستقبل کیا ہے؟

جواب: میں سمجھتا ہوں کہ نثری نظم لکھنا بہت مشکل کام ہے۔ ردھم شاعر کو راستہ دیتا ہے اور تشبیہ استعارہ علامت امیجری کی راہ ہموار کرتا ہے۔ جب کہ نثری نظم ردھم میں نہیں اس لیے اس کو دیگر شعری لوازمات کا زیادہ دھیان رکھنا پڑتا ہے۔ نثر میں شاعری پیدا کرنا جو اسے نثری ٹکڑے سے جدا کر دے اور معنی کی تکثیریت پیدا کر دے، شاعری کا وصف تشبیہ استعارہ علامت امیجری سے نظم تشکیل ہو تو وہ نثری نظم ہے ورنہ وہ نثری ٹکڑا ہے اور اسے ٹکڑے کر کے لکھ دیا گیا ہے۔ اس لیے نثری نظم کے نام پر لکھی ہوئی ہر نظم نظم نہیں بنتی۔ اسی لیے اس کی قبولیت کے مسائل ہیں۔ آزاد نظم جب آغاز ہوئی تو اس پر بھی بہت اعتراضات ہوئے لیکن اسے ایک بڑا شاعر راشد مل گیا اعتراضات اپنی موت آپ مر گئے لیکن نثری نظم کو ساٹھ برس گزرنے کے بعد بھی راشد جیسا شاعر نصیب نہیں ہوا۔ میرے خیال میں جب وہ شاعر آئے گا تو نثری نظم کا مستقبل اردو میں بھی دنیا بھر کی طرح مضبوط ہو جائے گا۔

13۔ کون سا ادارہ کون سا پلیٹ فارم ادب کی ترویج و ترقی کے لئے اہم کردار ادا کر رہا ہے؟

جواب: میں سمجھتا ہوں جمہوری ماحول میں ریاست ادب کی ترویج کی طرف متوجہ ہوتی ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ ہمارے ہاں بندوبستی جارح جمہوریت ہے۔ دوسری بات یہ کہ ریاست پاکستان کی ادب کی ترویج میں کوئی دلچسپی نہیں جس کا واضح ثبوت قائم شدہ اداروں کو دیا جانے والا بجٹ ہے جس سے وہ صرف اپنے ملازمین کی تنخواہیں پوری کرتے ہیں یا کچھ پروگرام کروا لیتے ہیں۔

دنیا بھر میں ریاست ادبی ادارے اس لیے قائم کرتی ہے کہ ادب کی ترویج ہو ادب کیسی معاشرے کا اصل چہرہ ہوتا ہے۔ ادب کی تاریخ مرتب کرنا، اس پر تنقیدی کام کروانا، ادبی تحقیق کروانا، کتب کی اشاعت، مقامی ادب کے مختلف زبانوں میں تراجم کروا کر دنیا بھر میں پیش کرنا، دنیا بھر کی زبانوں کے ادب کو مقامی زبان میں ترجمہ کروانا، ادبا و شعرا کی فلاح کے لیے انعامات اور ان کے مسائل کا تحفظ کرنا ہی ادبی اداروں کا اصل مقصد ہے لیکن ایسا نہیں ہو رہا ادارے موجود ہیں لیکن بجٹ نہیں۔

ماضی میں ترقی پسند مصنفین اور حلقہ ارباب ذوق نے شعر و ادب کی ترویج میں رجحان ساز کام کیا ہے۔ ترقی پسند مصنفین کی تحریک کو ریاست نے بند کر دیا لیکن اس کے اثرات ابھی تک جاری ہیں گو اب بھی پاکستان کے مختلف شہروں میں ترقی پسند مصنفین اور حلقہ ارباب ذوق کی شاخیں کام کر رہی ہیں لیکن یہ ماضی کی طرح فعال نہیں۔

ایک دو سرمایہ دار ادارے بھی ادبی فیسٹیول کروا رہے ہیں جن میں آکسفورڈ لٹریری فیسٹیول اور کراچی آرٹس کونسل کے ادبی میلے ہیں جو ادبی سماجیات میں ادیب اور شاعر کو ہیرو کے طور پر پیش کرتے ہیں اور ٹھہرے پانی میں کچھ دیر ہلچل بپا کرتے ہیں۔ یو بی ایل ہر سال لٹریری ایوارڈ جاری کرتا ہے جو آٹے میں نمک کے برابر ہے۔

کچھ شعرا و ادبا نے ذاتی تنظیمیں بنائی ہوئی ہیں وہ مشاعرے برپا کراتے ہیں۔ کچھ بیرون ملک بھی ایسی ہی تنظیمیں مشاعرے کروا رہی ہیں جن کو بجٹ سرمایہ دار اپنا سافٹ امیج برقرار رکھنے کے لیے مہیا کرتا ہے لیکن اکثریت یورپ و امریکی شعرا اپنے خرچے پر مشاعرے کرواتے ہیں۔

14۔ ادبی گروہ بندیوں کے بارے میں آپ کیا کہیں گے؟

جواب: ادبی گروہ بندیاں ہر دور میں رہی ہیں۔ دلی سے کرلاہور اور کراچی تک۔ کلاسیکی عہد میں دربار تک رسائی کی تگ و دو مرزا نوشہ کو بھی رہی۔ لکھنو میں بھی گروہ بندیاں تھیں پھر نظریاتی گروہ بندیاں شروع ہو گئیں جیسے ایہام گوئی کی تحریک، سرسید تحریک، رومانوی تحریک ترقی پسند مصنفین، حلقہ ارباب ذوق، اسلامی ادب کی تحریک، پاکستانی ادب کی تحریک، لسانی تشکیلات کی تحریک، جدیدیت کی تحریک، علامت نگاری اور وجودیت کی تحریک ان گروہ بندیوں نے ادب کی ترقی و ترویج میں اہم کردار ادا کیا نئے مباحث نئی موضوعات سے اردو ادب کے دامن کو وسیع کیا لیکن 70 کی دہائی کے بعد نظریاتی کی بجائے ذاتی گروہ بندیاں شروع ہو گئیں جن کا مقصد صرف مشاعروں میں جانا، نام لکھوانا، نام گنوانا، بیرون ملک رابطے بڑھانا اور مشاعرے پڑھنا رہ گیا۔ یہ گروہ بندیوں کا منفی چہرے ہیں جو زوال کی ایک اور علامت ہے۔

CamScanner

شاعری

دھیان کا ساگر

یہ سچ ہے کہ اظہار کو
لفظوں کی ضرورت ہے

جب دُنیا پریشاں ہو
انگشت بدنداں ہو
حالات سے نالاں ہو
لفظوں کو زباں دے کر
ہونٹوں کو بیاں دے کر
تم شعر سناتے ہو
اُمید بندھاتے ہو
معلوم ہے یہ سب کو
اپنے سے اُلجھنے کا
فن بھی تمہیں آتا ہے
لفظوں کو زباں دے کر
ہونٹوں کو بیاں دے کر
آئینہ دکھاتے ہو
تم کیسے دلاور ہو
تاروں کے دمکنے کو
بادل کے گرجنے کو
پانی کے کھنکنے کو
کنکر کے چمکنے کو
لفظوں میں سموتے ہو
کیا شعر پروتے ہو
تم کیسے دلاور ہو
ساجن اسی ماٹی کے ہو
یا سادھو میرے گاؤں کے
تم گاؤں میں رہ کر بھی
کیا نام اُگاتے ہو
اور مان بڑھاتے ہو
پنوں ہو کہ رانجھن ہو
کس سوہنی کے ساجن ہو
سچی کوئی دھڑکن ہو
خوابوں کے جزیروں کی
سپنوں کے گھروندوں کی
جب کونپلیں کھلتی ہوں
خوشبوئیں مہکتی ہوں
اور چوڑیاں بجتی ہوں
انگنا میں کوئی خالی
گاگر لیے چلتی ہو
تم دھیان کے ساگر سے
لفظوں کی کتھا بن کر
سنگیت کا رَس دے کر
نینوں کے سمندر میں
اک آگ لگاتے ہو
برہن کو رُلاتے ہو
تم کیسے دلاور ہو

بسمل صابری/ساہیوال

ہوا میں بے ثباتی کا نشاں بننے سے پہلے ہی
چلو، اک پل چمک جائیں دھواں بننے سے پہلے ہی
پھر اس کے بعد یہ عمریں ترسنے میں گزرنی ہیں
گلے مل لیں زمیں کے، آسماں ہونے سے پہلے ہی
نہ ایسا ہو، پروں کے ساتھ تنکے بھی بکھر جائیں
کہیں اُڑ جائیں شاخوں کے کماں بننے سے پہلے ہی
یہ اک لمحہ جو فیصل ہے، زمانوں بعد آتا ہے
ادھوری بات کہہ دیں داستاں بننے سے پہلے ہی
کوئی تے بے دفا وعدہ مسافر ریت پر لکھ لیں
رفاقت کے تیقن کے گماں بننے سے پہلے ہی

قیوم طاہر/اسلام آباد

اب ایسے چاک پر کوزہ گری ہوتی نہیں تھی
کبھی ہوتی تھی مٹی اور کبھی ہوتی نہیں تھی

اچانک مصرعِ جاں سے برآمد ہونے والے
کہاں ہوتا تھا تو. جب شاعری ہوتی نہیں تھی

ہم ایسی روشنی میں رہ چکے ہیں جو سراسر
تمہاری ہوتی تھی پر تم نے کی ہوتی نہیں تھی

بہت پہلے سے افسردہ چلے آتے ہیں ہم تو
بہت پہلے کہ جب افسردگی ہوتی نہیں تھی

پڑے ہوتے تھے جب ہم اپنے اپنے پہلوؤں پر
ہمیں کیا ایک دوجے کی پڑی ہوتی نہیں تھی

بغل میں شہر کا نقشہ تھا اور نقشے پہ نظریں
میں چل کر دیکھتا تھا جو، گلی ہوتی نہیں تھی

یونہی ہم آتے جاتے تیرا نقشہ کھینچ لاتے
ترے غرفوں کی غیبت کس گلی ہوتی نہیں تھی

نظر اُٹھتی تو اک تیری کمی سے بھر کے جھکتی
خبر اُڑتی تو بات ایسی کوئی ہوتی نہیں تھی

تجھے محسوس کرنے کی وہ کیا گھڑیاں تھیں جن میں
تجھے معلوم کرنے کی گھڑی ہوتی نہیں تھی

کتابِ خواب کی ترتیب، جب تک تو نہیں تھا
غلط ترتیب تھی اور ٹھیک بھی ہوتی نہیں تھی

جہاں زینہ اُترتا، ہم بھی پیچھے جا اُترتے
یہ کچھ بھی کہنے سننے کی گھڑی ہوتی نہیں تھی

میں تم سے بات کرنے کو کہا کرتا تھا جب بھی
پتا تھا کب سے تم نے بات کی ہوتی نہیں تھی؟

اور اب سامان پورا کیجیے یا دھیان پورا
گرہ جو کھول دیتے، کھولنی ہوتی نہیں تھی

دلوں میں جھانکا اور پھر ہم نے دنیا بھر میں جھانکا
محبت تجھ سے پہلے واقعی ہوتی نہیں تھی

چرانے والے ہم تیرے، چرانے میں رہے پر
برآمد ہم سے یہ چوری کبھی ہوتی نہیں تھی

وہ پانی عارضی ہوتا تھا تیری اوک والا
مگر اس کی روانی عارضی ہوتی نہیں تھی

کبھی دل اک جگہ، اک جسم میں ٹانکے گئے تھے
یہ دھڑکن دل یہ دل ایسے گڑی ہوتی نہیں تھی

ہم اپنی گم شدہ اک چیز تم میں ڈھونڈتے تھے
اور ایسی گم شدہ جو یاد بھی ہوتی نہیں تھی

ہمیں ان حالوں ہونا بھی کوئی آسان تھا کیا
محبت ایک تھی اور ایک بھی ہوتی نہیں تھی

دیا پہنچا نہیں تھا آگ پہنچی تھی گھروں تک
پھر ایسی آگ جس سے روشنی ہوتی نہیں تھی

نکل جاتے تھے سر پر بے سرو سامانی لادے
بھری لگتی تھی گٹھڑی اور بھری ہوتی نہیں تھی

ہمیں یہ عشق تب سے ہے کہ جب دن بن رہا تھا
شب ہجراں جب اتنی سرسری ہوتی نہیں تھی

ہمیں جا جا کے کہنا پڑتا تھا ہم ہیں یہیں ہیں
کہ جب موجودگی، موجودگی ہوتی نہیں تھی

بہت تکرار رہتی تھی بھرے گھر میں کسی سے
جو شے درکار ہوتی تھی وہی ہوتی نہیں تھی

کہو تو گفتگو سنواؤں تم کو ان دنوں کی
ہمارے درمیاں جب بات بھی ہوتی نہیں تھی

تمھی کو ہم بسر کرتے تھے اور دن ماپتے تھے
ہمارا وقت اچھا تھا گھڑی ہوتی نہیں تھی

شاہین عباس/شیخوپورہ

کسی کا کچھ اجارہ ہی نہیں ہے
محبت میں خسارہ ہی نہیں ہے

کدھر کو جانا ہے اب اس سے آگے
کہ منزل کا اشارہ ہی نہیں ہے

مجھے معلوم ہے انجامِ ہستی
بجز مرنے کے چارہ ہی نہیں ہے

انا کو روند کر کیسے پلٹتا
جسے ہم نے پکارا ہی نہیں ہے

اکٹھا کر دے ہم کو جوڑ دے پھر
یہاں ایسا ادارہ ہی نہیں ہے

اسے تفریق کر کے جب بھی دیکھا
تو منظر میں نظارہ ہی نہیں ہے

فریب دوستی پھر کیسے کھاؤں
کہ اب تو ضبط یارہ ہی نہیں ہے

میں کیسے مان لوں تو غم زدہ ہے
تری پلکوں پہ تارہ ہی نہیں ہے

سفینہ منزلوں کو کیسے ڈھونڈے
کوئی روشن منارہ ہی نہیں ہے

جلیل اب راکھ میں کیا ڈھونڈتے ہو
کوئی شعلہ، شرارہ ہی نہیں ہے

جلیل اس کو کوئی جا کر بتائے
کہ بن اس کے گزارہ ہی نہیں ہے

احمد جلیل/اوکاڑہ

تمہاری ان سنی باتیں، ہماری ان کہی باتیں
زمانہ چھیڑ بیٹھا ہے، نجانے کیوں وہی باتیں

سماعت ہے بلا کی اور ڈھنگ اپنا ہے دنیا کا
تکلم تھا خموشی میں مگر سنتی رہی باتیں

کسی کے راز پر پردہ کسی کے بانٹ لینا دکھ
ہمیشہ کام آئیں گی تمہارے تو یہی باتیں

ترستے ہیں سماعت کو پری وش کا حسیں لہجہ
اگر ہیں روبرو مشکل، پس چلمن سہی باتیں

وجود اپنا ہی رکھتی ہیں زمانے میں الگ بسمل
کہیں ظلمت کا موجب ہیں کہیں ہیں آگہی باتیں

عبدالوحید بسمل/ایبٹ آباد

صوت و آہنگ صبحِ خنداں کا
ساز تھا رازہائے پنہاں کا

جس کو منزل سمجھ رہا تھا میں
موڑ تھا کاکلِ پریشاں کا

شب ہجراں میں آشکار ہوا
تو ستارہ تھا "کنجِ مژگاں" کا

جس کو دنیا سمجھ رہی تھی حجاب
ایک دھوکا تھا چشمِ حیراں کا

جس سے ٹکرائی موجِ فکر مری
وہ کنارہ تھا بحرِ امکاں کا

گھیر لیتے ہیں ان گنت چہرے
جب اُٹھاتا ہوں پردہ نسیاں کا

بات ہونٹوں پہ آ کے ختم ہوئی
جب ہوا ذکر لعل و مرجاں کا

احمد ندیم رفیع/امریکا

میں جانتا ہی نہ تھا

میں جانتا ہی نہ تھا، بارشوں کے موسم میں
وہ ایک بوند مجھے پاؤں تک بھگو دے گی
نظر بچا کے زمانے کی بھیگی نظروں سے
دھنک کے رنگ مری آنکھ میں سمو دے گی

میں جانتا ہی نہ تھا، شام کا حسیں چہرہ
کسی کی پلکوں تلے اور بھی حسیں ہوگا
غروب ہوتی ہوئی ساعتوں میں ہر منظر
کسی کے قرب میں کچھ اور دل نشیں ہوگا

میں جانتا ہی نہ تھا، موسم بہاراں میں
تمام رنگ اسی پیرہن سے پھوٹیں گے
اسی کے حُسنِ قدم پر نثار ہوں گے سب
گلاب جتنے بھی شاخِ چمن سے ٹوٹیں گے

میں جانتا ہی نہ تھا، چودھویں کا پورا چاند
اسی جبیں کے کشادہ اُفق سے ہوگا طلوع
ذرا سا ڈھلکے گا چہرے سے جس جگہ آنچل
وہیں سے سلسلہ پھر چاندنی کا ہوگا شروع

احمد ندیم رفیع/امریکا

یہ بلا کیسے ٹلے گی سر سے
زندگی جس نے ملا دی تھر سے
بے حسی ہیں نے دلوں میں بھر دی
نام لکھو مرا آبِ زر سے
اُن کو بھی ساتھ ذرا لے لینا
وہ جو محروم ہیں بال و پر سے
کون رہ پائے گا محفوظ وہاں
آگ انبر سے جہاں پر برسے
فرض میرا ہے صدا دیتا چلوں
کوئی نکلے کہ نہ نکلے گھر سے
دل پہ کھایا ہے کوئی زخم نیا
حالِ دل جب بھی کہا پتھر سے
منتظر دیکھا ہے اک رنج نیا
جب بھی نکلا ہوں میں اپنے گھر سے
عزم ٹوٹا نہیں شاہد میرا
گو بہت ظلم کے پتھر برسے

ہمایوں پرویز شاہد/لاہور

وان گوگ Van Gogh

میں کہ تاریک عمارت سے تجھے تکتا ہوں
آسماں تیرے فسوں خیز ستاروں کا ہجوم
دائرے قوس بناتے ہوئے افکار و نجوم
کون سی یاد سے جڑ جاؤں؟
کیسے تلف کروں؟
زیست کا بار اُٹھاؤں؟
کہ کہیں دفن کروں؟

خود ہی رنگوں میں نہا کر تری تصویر بنوں
اپنی پوروں سے چھوؤں خلا کے آئینے کو
اک مرے لمس سے کھل جائیں سبھی راز و نیاز
آسماں وجد میں آ جائے مرے ہونے سے
اور ترتیب بدل جائے فسانے کی مرے
دور اُفق پار کہیں ٹوٹ کے تارا بکھرے
چھوڑ دے بامِ فلک کو مرا ہم راز بنے

آسماں کیوں مری تقدیر لکھے جائے گا؟
مرے افکار کو وحشت ہی کہے جائے گا
میں نے اب سوچ لیا ہے کہ بدل ڈالوں گا
ایک تعبیر جواب راس نہیں ہے مجھ کو
ایک احساس جو سن یاس نہیں ہے مجھ کو

وحشتِ دل کو خموشی کی بنا کر تصویر
دیکھتی آنکھ میں شہتیر سا بن جاؤں گا
وقت کے پاؤں میں زنجیر سا بن جاؤں گا

میں کہ تاریک عمارت سے تجھے تکتا ہوں
ہاتھ میں برش لیے رنگ نئے بھرتا ہوں

شائستہ مفتی/کراچی

ضرورت سے زیادہ رابطہ اچھا نہیں ہوتا
تجاوز میں کوئی بھی سلسلہ اچھا نہیں ہوتا
ضروری ہے مناسب فاصلہ تسلیم کرتا ہوں
مری جاں اس قدر بھی فاصلہ اچھا نہیں ہوتا
حقیقت ہے حقیقت سے مفر کس کو بخاری جی
کسی بھی ہاتھ میں گل ان کھلا اچھا نہیں ہوتا
رہے اوروں کا بھی سود و زیاں کچھ ذہن میں اپنے
فقط اپنے لیے ہی سوچنا اچھا نہیں ہوتا
اگر کچھ بات کرنی ہے تو پہلے سوچ کر بدلو
کہ سچ تو یہ زیادہ بولنا اچھا نہیں ہوتا
نہیں اس پر کیا کیوں غور کچھ ہم نے کبھی عاصم
جسے اپنا کہا اس کا گلہ اچھا نہیں ہوتا

عاصم بخاری/میانوالی

لبادہ اوڑھ کے دشمن مجھے ملتا ہے بھائی کا
مجھے امکان ہے اس شہر میں اپنی تباہی کا
شرافت نام کی کوئی نشانی تک نہیں تن
کہوں کیا اس زمانے کو، برائی کا بھلائی کا
ہمیشہ ناز، اپنے، زورِ بازو پر کیا جائے
توقع کیا، بھروسہ کیا، کسی طاقت پرائی کا
خود اپنی ذات سے ہوتی نہیں جس کو وفاداری
کرے وہ کس طرح شکوہ، کسی طاقت پرائی کا
وہ پل میں چھین لیتا ہے دلوں کو اس طرح عاصم
عطا قدرت نے فن اس کو کیا ہے دل ربائی کا

عاصم بخاری/میانوالی

سامنے کوئی راستہ بھی نہیں
میرا خود ہی سے رابطہ بھی نہیں
یاد رکھنا بھی اک عذاب ہوا
بھول جانے کا حوصلہ بھی نہیں
ایک دن وہ مجھے بلائے گا
کیا یقیں ہے جو ٹوٹتا بھی نہیں
وسوسے دل کو کیوں ستاتے ہیں
وہ ابھی تک تو بے وفا بھی نہیں
لحہ لحہ تمہارے نام کیا
اور کچھ میرے پاس تھا بھی نہیں

لبنیٰ صفدر/لاہور

زمینِ چشمِ نم میں ہم کو تیرا خواب بونا تھا
تری ہر یاد کا موتی تو پلکوں میں پرونا تھا
ملن کے موسموں میں جانے کیوں میں بھول بیٹھی تھی
تجھے بھی شہر کی اس بھیڑ میں اے دوست کھونا تھا
گرا ہے تو کئی ٹکڑوں میں وہ اب بکھرا پڑا ہوگا
تمہارے گیلے ہاتھوں میں جو شیشے کا کھلونا تھا
نہ جانے وقت نے کیوں فاصلے یہ دے دیے ورنہ
تمہی تو میرے جیسے تھے، تمہیں تو میرا ہونا تھا

لبنیٰ صفدر/لاہور

CamScanner

دامنِ فلک میں
ستاروں کے جھرمٹ میں
درختوں کی سرسراہٹ میں
رات کی تاریکی میں
سرد ہواؤں کے جھکڑ میں
راستوں کی سنساہٹ میں
دسمبر کے ابر آلود موسم میں
کہ جب سب مکیں
اپنے گھروں کو لوٹ چکے
اکلوتا چمکتا چاند جانے کس کا منتظر ہے
آسمان و زمین کی وسعتوں میں
رحمتوں اور نعمتوں کے درمیان
صبر اور شکر کی ادائیگی کے ساتھ
کرم اور فضل کی منتظر
دعاؤں اور التجاؤں کے ساتھ
میں بھی ان ستاروں جیسی ہوں
یا جھرمٹ میں سے کوئی اک ستارہ ہوں
تم تو چاند جیسے ہو
ہاں تم تو چاند جیسے ہو
جس کے چمکنے سے ستاروں کا وجود نکھرے گا
میں بھی تو اک مکیں ہوں اس خاکی دنیا کی
مگر چاند کے چمکنے کی منتظر ہوں
کہ
ابر آلود موسم میں راستہ نہیں ملتا
ابر آلود موسم میں راستہ نہیں ملتا......

ماریہ علی/لاہور

جب عین دل کے سامنے
اُداسیوں کا پھیرا ہو
غم کی آبشاریں ہوں
سمجھ میں پھر نہیں آتا
کہ ساتھ چھوٹ جانے میں
کسی کے چھوڑ دینے میں
ذرا سا فرق ہوتا ہے
فرشتہ موت کا آ کر
جو روح تک کھینچ لیتا ہے
تو بس میں کچھ نہیں رہتا
مسافر چھوٹ جاتے ہیں
تعلق ٹوٹ جاتے ہیں
دل بے تاب سا ہو کر اک سوال کرتا ہے
کسی کی چاہتوں کا سلسلہ ہی ٹوٹ جاتا ہے
ابھی کچھ یاد آیا ہے
کئی دن کی مسافت پر
وہ پہلے ہی تو جاتا تھا
میلوں کی مسافت پر
ملنے کے سب رابطے
کبھی ٹوٹ ہی تو جاتے تھے
ان فاصلوں کے بیچ تب
دعا تھا بس رابطہ
وہ مہکتا سا رابطہ
دل جس کو تھامتا
ہاں کبھی سوچو ذرا
اب بھی تو ہے فاصلہ
نہ بیچ میں کوئی رابطہ
ہاں فرق اتنا کہ اس نے
لوٹ کر آنا نہیں
یہ ہی طے ہے کہ اس سے
عمر بھر ملنا نہیں
تم اگر چاہو تو کوئی
رابطہ ممکن تو ہے
ان فاصلوں کے درمیاں
کوئی راستہ روشن تو ہے
یہ اگر ممکن نہیں تو
پھر ذرا تم سوچنا
کہ رک گیا کس موڑ پر؟
وہ چاہتوں کا سلسلہ
اور کس نے
کس کا ساتھ چھوڑا؟
یہ تم خود سے پوچھنا

شکیلہ سحر/فیصل آباد

ایک لمحہ چین جو پاتا نہیں
بے گھری کا خوف کیوں جاتا نہیں
نفرتوں کا راج ہے اس شہر میں
پیار کا موسم یہاں آتا نہیں
ہم فراقِ یار میں بے حال ہیں
مشکلوں سے جی تو گھبراتا نہیں
ایک چہرہ ایسا چھایا ذہن پر
من کو کوئی دوسرا بھاتا نہیں
آزمائی صبر کی باقی مگر
ضبط کا دل حوصلہ پاتا نہیں

عامر بن علی/جاپان

اُلجھنوں سے نجات کیسے ہو
دل سے دل تک کی بات کیسے ہو
جب مقدر میں نارسائی ہے
تیرے ہاتھوں میں ہات کیسے ہو
ساری دنیا سے جیت سکتا ہوں
تیری یادوں کو مات کیسے ہو
تو ہی جب اُٹھ گیا ہے محفل سے
انجمن میری ذات کیسے ہو
تو نے ڈالی سے جس کو توڑ دیا
پھر ہرا اب وہ پات کیسے ہو

عامر بن علی/جاپان

CamScanner

روشنی

روبنسن سیموئیل گل/راولپنڈی

''ڈیڈی آج بھی بجلی والے آئے تھے کہتے ہیں کہ کل تک بل جمع کروا دو، ورنہ ہم بجلی کاٹ دیں گے۔''

دس سالہ احمر نے پانی کا گلاس اپنی بڑی بہن کو تھماتے ہوئے فکر مندی سے کہا۔

''اچھا میں کل کچھ کرتی ہوں۔''

اُنیس سالہ روشنی کی حالت اُس بطخ کی مانند تھی جو پانی پر انتہائی اطمینان کے ساتھ تیرتی دکھائی دیتی ہے۔ تاہم زیرِ آب وہ بے حد مشقت کے ساتھ اپنے پنجے چپوؤں کی مانند چلا رہی ہوتی ہے۔ ابھی دو ماہ پہلے کی تو بات ہے اُسے کس قدر ذلت آمیز روّیے کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ بجلی کا بل یک دم بارہ ہزار روپے آگیا تھا۔ اتنی بڑی رقم اُس کے لئے ادا کرنا ممکن نہ تھا۔ محض اٹھارہ ہزار روپے ماہانہ تنخواہ اور نام نہاد کمیشن کے ذریعے جو اَب تک اُسے کبھی نہ ملا تھا، وہ مکان کا بارہ ہزار کرایہ ادا کرے، بہن بھائی کے سکول کی فیس ادا کرے، راشن لائے یا اپنی بیمار والدہ کی دوائی خریدے؟ وہ سوچتی کہ واقعی مہنگائی کے موجودہ حالات میں غریب کے پاس خودکشی کے سوا بچا ہی کیا ہے۔ افسوس کہ خودکشی مذہباً حرام ہے اور ایسا کرنے کے لیے بھی دلیری کی ضرورت ہوتی ہے چنانچہ مہنگائی کے باعث غریب خودکشی کر نہیں رہا ہوتا البتہ اُسے خودکشی کروائی جا رہی ہوتی ہے جسے سلو پوائزننگ (slow poisoning) یعنی تھوڑا تھوڑا زہر دینا کہتے ہیں۔ انسان خودکشی تو نہیں کرتا تاہم روزانہ تھوڑا تھوڑا مرتا جاتا ہے اور ایک روز واقعی مر جاتا ہے۔ اِس موت کا یہ فائدہ ہوتا ہے کہ گناہ بھی تصور نہیں ہوتا اور جرم بھی سب پر برابر برابر تقسیم ہو جاتا ہے تھوڑا مہنگائی نے مار دیا، تھوڑا حالات نے مار دیا، تھوڑا مایوسی و نا امیدی نے مار دیا، تھوڑا نا انصافی نے مار دیا، تھوڑا انتظام نے مار دیا۔ لہٰذا کوئی بھی پکڑ میں نہیں آتا اور انسان تھوڑا تھوڑا کر کے مر ہی جاتا ہے۔

روشنی کی چھوٹی بہن مہک نے سالن گرم کر دیا تھا۔ روشنی رات کا کھانا کھانے بیٹھی تو نوالہ اُس کے حلق سے نیچے نہ اترتا تھا۔ وہ کچھ سوچتے ہوئے ایک ہی لقمہ کتنی دیر تک چباتی رہی۔ پاس ہی بوڑھی ماں تھوڑی تھوڑی دیر بعد کھانستی تھی۔ شدید گرمی کے موسم اور بند سے مکان میں جہاں ہوا کا آنا جانا بھی خاصا مشکل تھا، صحت مند انسان کا بھی دم گھٹتا تھا اور وہ تو پھر بیمار تھیں۔ ایک پرانا سا لاہوری کولر تھا جو بوڑھی ماں کی اِس حالت کے باعث دن کے وقت چلتا رہتا تھا جب گرمی کافی تیز ہوتی تھی۔ تاہم روشنی آتے ہی وہ کولر بند کروا دیتی تھی کہ اب شام ہو گئی ہے اِس کی کوئی ضرورت نہیں۔

اب تک اُس ذلت آمیز روّیے اور جنسی بھوک کے باعث بلکتی تڑپتی ہوئی نظروں کو نہ بھولی تھی۔ وہ انتہائی سادہ لباس پہنتی تھی۔ اپنے سر اور بدن کو بڑی سی چادر سے ڈھانپتی تھی۔ وہ اپنے نام کی طرح خوب صورت تھی۔ کھلی ہوئی سفید رنگت، سرخ ہونٹ، دل کش آنکھیں جنہیں سیاہ اور بڑی بڑی پلکوں نے ڈھانپ رکھا تھا۔

اُس روز وہ اپنے بھائی کو ہمراہ لے کر گئی کیوں کہ پہلی بار واپڈا کے دفتر جا رہی تھی۔ پڑوسن نے بتایا تھا کہ بل زیادہ ہو تو واپڈا والے قسطوں میں بھی کر دیتے ہیں۔ روشنی کی سادگی کہ اُس دفتر میں بیٹھے ایک ملازم سے کہا کہ ہمیں بجلی کے بل پر ڈسکاؤنٹ کروانا ہے۔ یہ بہت زیادہ آگیا ہے۔ یہ سنتے ہی وہاں موجود تمام عملہ تضحیک آمیز انداز میں ہنسنے لگا۔ ملازم نے کہا،

''بی بی یہ کوئی کپڑے کی دکان نہیں ہے جہاں بھاؤ تاؤ کیا جاتا ہے اور قیمت میں کمی کروائی جاتی ہے یہ سرکاری دفتر ہے اور آپ لوگوں نے بجلی استعمال کی ہے تو اس لئے بل آیا ہے۔''

''لیکن ہمارے حالات بہت مشکل ہیں۔ بارہ ہزار تو بہت زیادہ ہیں۔'' روشنی کو اندازہ ہو رہا تھا کہ عملے کے لوگ اپنا اپنا کام چھوڑ کر اُس کے چہرے کے نقوش اور چادر کے باوجود بدنی خدوخال کا بھی بغور جائزہ لے رہے ہیں۔ وہ وہاں ایک لمحے کو بھی رُکنا نہیں چاہتی تھی۔ وہی ملازم بولا،

''بی بی، آپ کا بل معاف شاف نہیں ہو سکتا۔''

اور پھر معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ روشنی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا،

''پچھلے کمرے میں جائیں وہاں غفار صاحب ہوں گے، اُن سے قسطیں کرا لیں۔''

اور پھر یہ کہتے ہوئے اُس کی غلیظ آنکھیں روشنی کے سر سے پاؤں کی جانب پھسلتی ہی چلی گئیں۔

روشنی فوری طور پر پچھلے کمرے کی جانب چلی گئی۔ وہاں بھی اُسے انتظار کرنا پڑا کیوں کہ غفار صاحب آدھے گھنٹے بعد پہنچے اور انھوں نے بھی یہ کہہ کر بے عزت کیا کہ بی بی اِتنا زیادہ بل ہم خود سے نہیں بھیج دیتے، تم لوگ بجلی استعمال کرنے میں بھی شاہ خرچ ہو تو بل تو پھر زیادہ ہی آئیں گے ناں۔ جتنے یونٹ اُتنے پیسے!

''بس سر، ہمارے گھر میں تو لائٹ پنکھا ہی ہے ایک کولر تو کچھ دیر کے لئے چلاتے ہیں۔ والدہ بیمار ہیں تو انھیں بہت زیادہ گرمی لگتی ہے۔''

''ہاں تو استری بھی ہوگی آپ کے گھر، چھوٹا سا فریج بھی ہوگا، موبائل بھی چارج کرتے ہو گے۔''

''جی بالکل سر!''

''تو یہ سب تو سورج کی توانائی سے چلتا ہوگا؟''

''جی نہیں سر!'' روشنی نے غفار صاحب کے آخری جملے میں چھپے طنز کو بھانپ لیا تھا۔

''بس بی بی، پھر اِتنا بل نہ آئے تو اور کتنا آئے۔ آپ کو ادا تو ہر صورت کرنا پڑے گا۔ یونٹس مہنگی ہوگئی ہیں۔ ہاں البتہ اِس میں یہ کیا جاسکتا ہے کہ مَیں دو قسطیں کر دیتا ہوں۔ یہ چھ ہزار آپ کو آج ہی بنک میں جمع کروانے ہوں گے۔''

روشنی کو تنخواہ ملی تھی، جس میں سے بارہ ہزار روپے وہ گھر کے کرائے کے لئے پہلے ہی الگ کر چکی تھی، اب چھ ہزار ہی بچے تھے سو اُس نے بجلی کے بل کی پہلی قسط ادا کر دی۔ بینک میں لمبی قطار تھی لہٰذا اُس روز وہ دفتر نہ جا سکی۔

اگلے ماہ پچھلی قسط ملا کر بل انیس ہزار آ گیا۔ یہ ادا کرنا تو اور بھی مشکل ہوگیا۔ روشنی میں اِتنی ہمت نہ تھی کہ وہ دوبارہ بجلی والوں کے دفتر جا کر افسروں کی کھری کھری سنتی ویسے بھی پچھلی بار چھٹی کرنے کے باعث اُسے اپنے دفتر میں بھی باس کی کھری کھری سننا پڑی تھیں۔ انہوں نے اگلی بار چھٹی کرنے پر تنخواہ کاٹنے کی دھمکی بھی دے دی تھی۔

روشنی نے اپنی کشتی کو حالات کے دھارا پر چھوڑ دیا کہ دیکھو کھیتے کھیتے کس سمت کو جاتی ہے۔ کوشش کے باوجود بل جمع کروانے کی آخری تاریخ گزر گئی تھی اور لیٹ فیس کے ساتھ رقم بیس ہزار روپے سے بھی زیادہ ہوگئی۔

دس سالہ احمر بے چارہ سکول کے بعد گھر آتا، یونیفارم اتارتا اور قریب ہی ایک سبزی کی دکان پر جا بیٹھتا۔ روزانہ تین گھنٹے کام کے اُسے ڈیڑھ دو سو روپے مل جاتے اور وہ اکثر ایک آدھی سبزی بھی لے آتا تھا جو گاہکوں کی طرف سے رد ہوئی ہوتی تھی۔

روشنی کی کوشش تھی کہ چھوٹی بہن مہک کو میٹرک ہی کروا دے مگر ماں کی بیماری کے باعث ناممکن ہوگیا کیوں کہ کسی ایک کو تو تیمارداری کے لئے گھر رکنا پڑتا تھا۔ لہٰذا مہک آٹھویں کلاس میں چلی تو گئی مگر چند ماہ بعد ہی فیس نہ ادا کرنے کے باعث اور پھر ماں کے بیمار ہو جانے سے اُسے تعلیم کو خیر باد کہنا پڑا۔ اچھا ہی ہوا ورنہ وہ بھی جوان ہو رہی تھی اور روزانہ سکول آنا جانا بھی عذاب بنا ہوا تھا۔ معاشرے کی بے شمار قباحتوں میں سے ایک صنفِ نازک کو گھورتے چلے جانا اور اُن پر غیر اخلاقی و بے ہودہ انداز میں آوازے کسنا بھی شامل ہے۔ جوانی کی دہلیز پر قدم رکھے ہوئے مہک کو دلی تسکین تھی کہ اب وہ گھر میں محفوظ رہتی ہے۔ اُس نے خود سے مطالعہ جاری رکھا ہوا تھا کیوں کہ وہ کتابیں پڑھنے کی شیدائی تھی۔ اب یہ تیسرا مہینہ تھا جب بجلی کا بل جمع ہوتے ہوتے چھتیس ہزار ہو چکا تھا گویا روشنی کی دو ماہ کی تنخواہ۔ اوپر سے واپڈا والے آج بجلی کاٹ دینے کی دھمکی بھی دے گئے تھے۔

تبھی اُس نے اگلے روز اپنے باس سے مطالبہ کیا،''سر مجھے ایک ماہ کی تنخواہ ایڈوانس مل سکتی ہے۔ بجلی کا بل چھتیس ہزار روپے آگیا ہے۔ والدہ بیمار ہیں۔ ہمارا گزارا تو ہو جائے گا مگر وہ بجلی کے بغیر سارا دن کیسے گزاریں گی؟ سر، اگر مَیں نے آج بل جمع نہ کروایا تو ہماری بجلی کٹ جائے گی۔ اِس لئے اس ماہ کی سیلری کے ساتھ ایک سیلری ایڈوانس دے دیں۔''

باس نے اپنی مونچھوں کو تاؤ دیا اور موبائل پر سے اپنی نگاہیں اٹھا کر روشنی کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا اور معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے بولا،''میڈم آپ کو ایڈوانس کی کیا ضرورت ہے آپ بس خود تھوڑی سی ایڈوانس ہو جائیں تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ ترقی پسند سوچ رکھیں، دقیانوسی خیالات اور رسم و رواج سے باہر نکلیں، زندگی لطف اٹھانے کا نام ہے۔ لطف اٹھایئے! اگر انسان کے پاس کھانے کے لئے بھی پیسہ نہ ہو تو زندگی سے لطف نہیں، غم ہی کشید کیے جا سکتے ہیں۔ میڈم، ہم لوگ دقیانوسی سوچ کے باعث خود اپنی زندگی کو قابلِ رحم اور دُکھی بنا لیتے ہیں۔ اپنی شخصیت، حیثیت اور صلاحیتوں کو پہچانیے۔''

''سر، مَیں نے کیا پہچاننا، ایک میٹرک پاس عام سی لڑکی کی کیا حیثیت ہوگی جس کا باپ بھی محنت مزدوری کرتے ہوئے حادثے کا شکار ہوگیا۔ جب وہ تھے تو زندگی اِتنی کٹھن نہ تھی۔ وہ ہوتے تو مجھے ضرور آگے پڑھاتے اور میری صلاحیتوں کو نکھارتے۔ اُن کے بعد مَیں پڑھ سکی اور نہ کوئی ٹریننگ کر سکی۔ ہماری تو رشتہ داری بھی بڑے لوگوں کے ساتھ نہیں ہے۔ آپ میری کس حیثیت اور کس صلاحیت کی بات کر رہے ہیں؟''

''میڈم، ہیرے کو اِس بات کا ادراک نہیں ہوتا کہ وہ ہیرا ہے۔ یہ جوہری ہی کھوجتا اور تصدیق کرتا ہے۔ حیثیت نہ ہو تو حیثیت بنانی پڑتی ہے، بڑے لوگوں کے ساتھ رشتہ داری نہ ہو تو رشتہ داری بنانی پڑتی ہے۔ اپنا اسٹائل بدلیں لوگوں کے ساتھ تعلقات بنائیں۔ زندگی سے لطف اٹھائیں۔ اِسی کا نام زندگی ہے۔''

''سر جسے آپ زندگی کہہ رہے ہیں، وہ زندگی نہیں موت ہے، سراسر تاریکی اور گناہ ہے۔''

باس نے اپنی نشست سے اُٹھتے ہوئے کہا، ''چلیں پھر گزاریں آپ نیکی اور پارسائی کی زندگی فی الحال ہمارے پاس گنجائش نہیں کہ ایڈوانس دے سکیں ویسے بھی آپ کمپنی کے دیے گئے ٹارگٹس ہی حاصل نہیں کر پا رہیں۔ اگر یہی حال رہا تو اگلے ماہ تک اپنے آپ کو فارغ ہی سمجھیں۔''

یہ کہتے ہوئے باس نے اپنا موبائل اور سگریٹ کی ڈبی اٹھائی اور سگریٹ کو لائٹر سے سلگاتا ہوا بولا، ''میری باتوں پر ذرا دھیان سے غور کرنا، ایڈوانس چاہیے تو ایڈوانس بننا پڑے گا۔''

یہ کہہ کر اُس نے سگریٹ کا دھواں روشنی کے چہرے پر چھوڑا اور کمرے سے نکل گیا۔

روشنی پرنم آنکھوں کے ساتھ اپنی کرسی پر آ کر بیٹھ گئی۔ چند اور لڑکیاں بھی اپنے اپنے فونز پر کسٹمر سے بات کرنے میں مصروف تھیں۔ یہ فضول سا ڈسکاؤنٹ کارڈ تھا جس کی سالانہ پانچ ہزار فیس تھی اور اس کارڈ کے حامل شخص کو مختلف برانڈز پر پانچ سے دس فیصد ڈسکاؤنٹ ملتا تھا۔ اسی کارڈ کی سیل بذریعہ ٹیلی فون کالز روشنی کی ذمہ داری تھی مگر موجودہ حالات میں اس قسم کی چیزیں کون خرید سکتا تھا پورا ملک ہی معاشی دباؤ سے گزر رہا تھا۔ امیر لوگ جو مہنگے برانڈز کی چیزیں افورڈ کر سکتے ہیں اُن کو ایسے کارڈوں کے ذریعے رعایت حاصل کرنے کی ضرورت ہی نہ تھی۔

روشنی نے کسی کسٹمر کو کال کرنے کے لیے فون ہاتھ میں پکڑا تو بھائی کی کال آ رہی تھی۔

''ہاں احمر، بولو کیا ہوا، امی تو ٹھیک ہیں ناں؟''

''ہاں، ہاں دیدی امی ٹھیک ہیں لیکن ابھی سکول سے آیا ہوں تو بجلی والے آئے ہوئے تھے۔ کہہ رہے تھے کہ بل دکھاؤ جو جمع کروایا ہے۔ دیدی بل جمع ہو گیا ہے ناں؟''

روشنی پر گویا سکتہ طاری ہو گیا۔ ''نہیں، احمر تم فکر نہ کرو انہیں کہو کہ پانچ بجے سے پہلے ہو جائے گا۔ میں ابھی آفس میں ہوں۔''

''دیدی، میں نے انہیں کہا تھا کہ آج میری دیدی بل جمع کروا دیں گی تو وہ ہنستے ہوئے بولے، دیدی کو بتانا کل بل نہ دیا تو ہم دل بھی لے جائیں گے۔ پھر نہ کہنا کہ اندھیرا ہو گیا ہے۔ دیدی واقعی اگر بجلی کٹ گئی تو امی کا دل تو ویسے ہی بند ہو جائے گا۔ اُن سے تو نہ گرمی برداشت ہوتی ہے اور نہ اندھیرا، دیدی آپ آج ضرور بل جمع کروا دینا، او کے خدا حافظ!''

روشنی سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ ایڈوانس سیلری مل بھی جائے تو مکان کا کرایہ، امی کی دوائی راشن ... آخر پورا مہینہ کیسے گزرے گا؟ لفظ ایڈوانس اُس کے سر میں بار بار ہتھوڑے کی مانند لگ رہا تھا۔

''میڈم آپ ایڈوانس ہو جائیں تو آپ کو ایڈوانس کی ضرورت ہی نہ رہے گی۔''

اُس کے ارد گرد بیٹھی بعض لڑکیاں واقعی ایڈوانس تھیں، وہ کسٹمر سے فون پر گھنٹوں گھنٹوں ہنستے مسکراتے باتیں کرتی رہتی تھیں اور سیلری کے ساتھ ساتھ اچھا خاصا کمیشن بھی بنا لیتی تھیں۔ پانچ ہزار کا ایک کارڈ سیل کرنے پر پانچ سو روپے سیلز گرل کو ملتے تھے۔ جو روشنی اب تک شاید تین یا چار مرتبہ حاصل کر پائی تھی۔ وقت تیزی سے گزر رہا تھا اور روشنی کی کشمکش بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ آخر پانچ بجنے میں آدھا گھنٹہ ہی باقی تھا جب اُس نے کپکپاتی انگلیوں سے ایک بار پھر ایک نمبر ڈائل کیا۔ یہ نمبر کسی کسٹمر کا نہیں بلکہ اُس کے باس کا تھا۔

''سر پلیز مجھے ایڈوانس سیلری چاہیے، مجھے والدہ کے لیے میڈیسن بھی خریدنا ہے۔''

کچھ لمحے کے لیے خاموشی رہی اور روشنی غور سے دوسری جانب سے آنے والی آواز کان سے لگائے موبائل کے ذریعے سنتی رہی۔ اُس کی بڑی بڑی آنکھوں سے آنسو ٹپک کر اُس کے رخساروں پر بہتے چلے جا رہے تھے اور سسکیوں کے ساتھ وہ ایک ہی الفاظ بار بار دہرا رہی تھی، ''رائٹ سر، جی آل رائٹ... جی ... جی سر او کے ... بالکل ٹھیک سر میں سمجھ گئی۔''

اُس نے اپنے آنسوؤں کو پونچھا۔ ایڈوانس کا بندوبست ہو گیا تھا۔ انتہائی بوجھل قدموں کے ساتھ اُس رات نو بجے وہ باس کی گاڑی میں گھر پہنچی۔ بھائی پریشانی کے عالم میں اُس کا منتظر تھا۔

''دیدی کیا ہوا آپ کا موبائل بھی بند تھا۔ بنک تو پانچ بجے بند ہو جاتے ہیں۔ آپ نے دیر کیوں لگا دی؟ کیا بجلی کا بل جمع ہو گیا؟ آج تو وہ ہمارا میٹر کاٹ ہی دینے والے تھے۔ بتائیں نہ دیدی بل جمع ہو گیا؟''

روشنی نے مُردنی کے عالم میں کہا، ''ہاں، احمر بل جمع ہو گیا۔''

''مگر دیدی بنک تو پانچ بجے بند ہو جاتے ہیں آپ نے کیسے جمع کروایا؟''

روشنی نے احمر کو بل تھمایا، جو کہ اب بھی صاف ستھرا تھا۔

''مگر دیدی اس پر تو بنک کی مہر ہی نہیں۔''

''احمر میرے باس نے یہ بل آن لائن جمع کروا دیا ہے... اور یہ لو... امی جان کی میڈیسن... اور ہاں میں آج تم دونوں کے لئے روسٹ چکن لائی ہوں۔''

واہ دیدی اتنا کچھ... !میں سوچ رہا تھا مجھے ویسے ہی روسٹ کی خوشبو آ رہی ہے... مگر آپ خوش کیوں نہیں ہیں، دیدی؟''

روشنی اپنی پُرنم آنکھوں کو پونچھتے ہوئے واش روم کی جانب بڑھ گئی۔ جس روشنی کے لئے وہ اتنے جتن کر رہی تھی آج وہی روشنی اُسے سنہری سانپ کی مانند ڈس رہی تھی۔ وہ اپنا چہرہ اپنے بہن بھائی اپنی بیمار ماں حتیٰ کہ خود اپنے آپ سے بھی چھپانا چاہتی تھی۔

احمر نے چکن کا پیس کھاتے ہوئے کہا، ''آپ کے باس تو بہت اچھے ہیں۔''

وہ احمر کی نظروں سے نظریں نہیں ملا پا رہی تھی خاموشی سے واش روم میں چلی گئی اور بنا روشنی جلائے ایک کونے میں کھڑے دیوار سے ٹیک لگا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ایڈوانس ہو جانے کے باعث بجلی کٹنے سے بچ گئی تھی چنانچہ اُس کا گھر تو روشن ہو گیا تھا... مگر افسوس... اُس کا باطن، اُس کا اندرون، اُس کا دل ہمیشہ ہمیشہ کے لئے تاریک ہو چکا تھا۔

دشتِ زندگی

آسناتھ کنول/لاہور

اپنے ہی وجود میں لگی اُس نامعلوم آگ کو سرد کرنے کی جدوجہد میں وہ زندگی کے سولہ سال گزار گئی تھی۔آگ جو کبھی سرد نہیں پڑتی تھی مگر وہ تسلیوں کی برف سے اپنے جلتے وجود کو ٹکور کرنے لگتی، شاید کچھ سکون ملے۔جلتی ہوئی آنکھوں میں انگارے اُتر آتے۔دل پھڑ پھڑاتے پرندے کی مانند پسلیوں کا جال توڑ دینا چاہتا تھا۔کیوں! آخر میرے ساتھ ہی ایسا کیوں؟اک سوالیہ نشان اس کے کانپتے وجود کو گھیرے میں لے لیتا۔اُس کا دم گھٹنے لگتا۔وہ سوچ کی وادی میں جا اُترتی۔جہاں کبھی دور تک رعنائی تھی۔اس کی انگنائی میں ڈھول تاشے بجتے تھے۔جہاں آج ویرانیوں کا راج تھا۔ہائے نغمہ تجھے کیا ہو گیا ہے۔سہلیاں پوچھتیں۔پڑوسنیں سمجھانے آجاتیں۔مگر دل وہ باتیں کہاں سمجھتا تھا۔اُسے تو اپنے رانجھن کی یاد سے ہی نکلنے کی فرصت نہ تھی۔زندگی نے قدری اور بے ثباتی کے کس موڑ پر لے آئی تھی۔آج بھی وہ بے طرح مچلی تھی۔ہمسائے میں شادی تھی۔اُس کی بچپن کی سکھی آج دلہن بن کر پیا کے دیس سدھارنے والی تھی۔وہ اُسے مل کر کیا آئی کہ اُس کے اپنے سارے زخم ہرے ہو گئے۔جب بھی وہ کسی تازہ دم شرمائی، لجائی دلہن کو دیکھتی،اُس کے وجود میں کیلیں گڑ جاتیں۔کانٹے سے چبھنے لگتے۔ایک دشت سارے معبود پر اُتر آتا۔آنکھیں ساون بھادوں بن جاتیں مگر دشت کی پیاس نہ بجھ پاتی۔اُسے سولہ سال پہلے کا وہ دن یاد آیا جب وسیم اُس کا تایا زاد اُسے بیانے دُلہا بن کر آیا تھا۔بانکا، سجیلا وسیم جسے نغمہ جیسی حسین بیوی ملی تھی۔بچپن کی محبت تھی۔جتنے خوش ہوتے اُتنا کم تھا۔زندگی کا مقصد مل گیا تھا اور بھلا چاہیے کیا۔رنگ و نور کی وہ رات بھلا کوئی بھول سکتا تھا۔وسیم کی محبت کی نرم پھوار نے نغمہ کا تن من رسیلا کر دیا تھا۔اُس کے چہرے کی تابانی پر تو کسی کی نظر نہ ٹھہرتی تھی۔محبت کا ایسا رنگ چڑھا تھا کہ اپنا پرایا رشک کرتا تھا۔مگر یہ حسیں لمحات ایک ماہ کے بعد ہی ختم ہو گئے۔جب وسیم کا امریکہ کا ویزہ آ گیا اور وہ نغمہ کو اپنے پاس بُلا لینے کا وعدہ کر کے اُسے روتا دھوتا چھوڑ گیا۔

وقت تنہائی کی گود میں کٹنے لگا اور نغمہ کے وجود میں اک اور وجود کی خبر نے سارے خاندان کو نہال کر دیا۔ساس سسر تو ہر ممکن اس کی دلجوئی کرتے مگر وہ برہا کی ماری کسی کا یقین نہ کرتی۔شروع شروع میں تو وسیم کے خط اور فون آتے رہے۔وہ لمبی لمبی باتیں کرتے اور خط لکھتے۔یونہی یاس اور نراش کے چکر کے درمیان وقت گزر گیا۔اور وہ ایک بیٹے کی ماں بن گئی۔نغمہ تڑپ تڑپ گئی کہ وسیم کو پتہ چل جائے۔مگر نہ وسیم کا فون ملتا نہ خط کا جواب آتا۔درد کے بحر بے کراں میں غوطے کھاتی۔نغمہ ویرانی کی تصویر نظر آنے لگی۔اپنے حسین دلہا کے انتظار میں زندگی گزارنے لگی۔ایک سال،دو۔تین،چار۔ظلم تھا۔سراسر ظلم۔نغمہ کا انتظار جواب دے گیا تھا۔نہ راتیں چین لینے دیتیں۔نہ دن آرام سے گزرتا۔بے قراریاں اس کے وجود کو چر کے لگاتیں۔بستر پر تنہا لیٹی وہ کروٹیں بدلا کرتی۔بچہ سکول جانے لگا تو وہ اور تنہا ہو گئی۔اپنے آپ سے ہی شکوے کرتی۔کبھی خدا سے شکوہ کناں ہوتی۔ساری زندگی کی محبت سمٹ کر بس اُس مرکز پر آئی۔تو محبت کے پھولوں سے بھری یہ کیاری کسی ان دیکھے طوفان میں اُجڑ گئی۔برباد ہو گئی۔آخر ایسا کیا گناہ ہوا تھا۔وہ اکثر سوچ سوچ کر نڈھال ہوتی رہتی۔سوکھ کر کانٹا ہوتی جاتی تھی۔ماں باپ سے بھی وسیم کا رابطہ بس برائے نام ہی تھا۔سارا خاندان تشویش میں مبتلا رہتا۔گھر سے دور ہونے یا بے وفائی کی یہ کوئی پہلی مثال تو نہ تھی۔ہر دوسرے چوتھے گھر میں بعین یہی داستان کسی نہ کسی رنگ میں دہرائی جاتی ہے۔باہر جانے والوں کا دکھ تو دور کا ہوتا ہے کہ اپنی اوقات سے بڑھ کر جینے کے سامان اور جدوجہد انسان کو کسی طرح اپنوں سے دور کر دیتی ہے۔وہ جذبات کو کتنا سستا اور بے معنی بنا دیتے ہیں۔خود ہی بکاؤ مال بن کر پھرتے ہیں کہ کوئی بھی اُنہیں آکر خرید لے۔جو اچھے دام دے بندہ اُسی کا ہو جائے۔زندگی ایسی تو نہ تھی۔اُنہوں نے تو ساتھ جینے ساتھ مرنے کی قسمیں اُس وقت دھرانی شروع کر دیں تھیں جب پڑھائی کا زمانہ شروع ہی ہوا تھا۔وہ دونوں جانتے تھے کہ ایک دوسرے کے لئے بنے ہیں تو پھر دوری کا یہ ناگ کہاں سے سرسراتا ہوا آ گیا اور نغمہ کو ڈس گیا۔وہ آج بھی حسب معمول اپنے کمرے میں میز کے پاس بیٹھی وسیم کی جدائی کو رقم کر رہی تھی۔اک ہوک سی لبوں پر سجائے کہ شاید اُس کا فون آجائے۔ایسا نہ ہو کہ گھنٹی بجتی رہے اور وہ ادھر اُدھر ہو تو فون مس ہو جائے۔مگر ضروریات اور مجبوریاں تو کہیں بھی ہو جاتی ہیں۔پھر اُس کے ساتھ ایسا کیوں؟ وہ سوچوں میں گم تھی کہ اماں بہت اُداس نظر آئیں۔اُداس تو وہ بھی رہتی تھیں۔مگر آج اُداسی کی نوعیت پریشانی میں بدلی ہوئی تھی۔سارا خاندان جیسے

سوگ کی کیفیت میں گھوم رہا تھا۔کیا ہوا تائی اماں؟وسیم کی کوئی خبر۔خلاف توقع اماں خاموش ہی رہی۔اماں کچھ تو ہے مجھے بتا دو۔ میرا دل بڑا پکا ہے۔مروں گی نہیں۔وسیم کو کچھ ہوا ہے؟ کیا اُس نے وہاں شادی کر لی ہے۔ مجھے طلاق بھیج دی ہے یا وہ مر گیا ہے۔نغمہ نے بڑی بے رحمی سے یہ سوال پوچھے تو اماں کا دل کلیجہ کٹ گیا۔چپ رہ ایسی بُری باتیں منہ سے نہ نکال۔اماں اب میرے لئے کون سی اچھی بات رہ گئی ہے۔میرا بیٹا پانچ سال کا ہو گیا ہے۔سب کے باپ ہوتے ہیں۔اُسکا نہیں ہے۔کیا جواب دوں اُسے۔اماں پھر تڑپ اُٹھی۔زندہ ہے اس کا باپ خیر سے۔اماں میرے لئے تو مر چکا ہے ناں۔اپنے پانچ سال کے بچے کو ابھی تک وہ بدنصیب نہیں دیکھ سکا۔ایک ماہ کی دلہن کو وہ چھوڑ کر ایسے گیا جیسے جانتا ہی نہ ہو۔یہی دکھ تو میری جان بھی لے رہا ہے۔مگر میں کیا کروں۔تو نے تو وفا نبھائی ہے۔اب پتہ نہیں اس خیر جو گئے کے ساتھ کیا گزری۔سارے رشتے،سارے تعلق کیسے بھلا دیئے اُس نے۔اماں کوئی بات ہے ضرور جو آپ مجھ سے چھپا رہی ہو۔کیا بتاؤں تمہیں جیون جو گئے۔دو سال بعد ہی اُس نے وہاں شادی کر لی ایک امریکن گوری کے ساتھ۔وہ ایک امیر لڑکی تھی۔اسے پیسے کا لالچ تھا۔وہ لڑکی اتنی چالاک تھی کہ اُس نے پوری طرح اسے قابو کر لیا۔وہ اس کی ہر حرکت پر نظر رکھتی۔وہ اُس کے فارم ہاؤس کا مالک نہیں بلکہ ملازم تھا۔نہ وہ خط لکھ سکتا، نہ فون کر سکتا تھا۔بس اُسی کی نوکری پر رہتا۔پہلے پہل تو وہ بڑا خوش تھا کہ امیر عورت مل گئی، اب پچھتا رہا ہے کہ اُس نے ایسا کیوں کیا۔مجھے تو پہلے ہی شک تھا اماں۔ویسے ہی تو لوگ اپنے پیاروں کو نہیں بھولتے ناں۔کہاں سے پتہ چلا یہ سب۔نغمہ پھر سے ٹوٹ کر بکھر گئی۔آنسوؤں کی دھند میں کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔اماں! اچانک وہ اماں سے مخاطب ہوئی۔اُسے لکھ کہ مجھے طلاق بھیج دے۔ہائے میں مر گئی۔اماں بدحواس سی ہو کر بولی۔اماں وہ میرے لئے نہیں تمہارے لئے ہی آئے گا۔اُس نے میری محبت کو تار تار کر دیا۔میری محبت اور وفا کا یہ صلہ تھا۔میرا قصور بتاؤ۔اماں اب نہیں۔میرے لئے نہیں۔اکیلی زندگی گزار لوں گی۔مگر اُسے زندگی میں شامل نہیں کروں گی۔وہ اکیلا وہاں کسی مصیبت میں ہوتا تو معاف کر دیتی۔مگر وہ تو شادی کر کے مصیبت میں پڑا۔ہم اُس کے لئے کچھ بھی نہ تھے۔کتنی جلدی بھول گیا۔اب ہم آپس کے کچھ بھی نہیں، کچھ بھی نہیں۔نغمہ آنکھوں میں برسات لئے اپنے کمرے میں آئی۔اور تڑپ تڑپ کر رو دی۔اللہ تو نے میری قسمت کیا لکھی۔شام کو تایا کے گھر آنے پر اچھا خاصا ہنگامہ ہو گیا۔تائی اماں نے سب کچھ اُن کے گوش گذار کیا۔اور یہ بھی کہ نغمہ طلاق چاہتی ہے۔تایا جان افسردہ ہو گئے۔غلطی تو ہمارے ہی بیٹے کی ہے۔نغمہ بیٹی کو کیوں کہہ رہی ہو۔وہ حق پر ہے۔پچھلے چھ سالوں سے وہ اس کا انتظار کر رہی ہے اور وہ بدبخت اپنا بیٹا بھی دیکھنے نہیں آ سکا۔وہ جیسا چاہتی ہے اُسے کرنے دو۔تو اُس کے بچے کا کیا بنے گا۔کچھ نہیں جیسا اُس کی ماں بہتر سمجھے گی۔کیا مطلب! اماں چونک گئی۔وہ ہمارا بچہ ہے۔ہمارا خون ہے ہمارے پاس رہے گا۔تائی امان نے فیصلہ سُنایا۔نہیں نسرین بیگم۔پہلے وہ باپ سے محروم ہے۔اب کیا اُسے ماں سے بھی چھین لوگی۔تائی کسی گہری سوچ میں گم تھی۔میں کہتی ہوں آپ ایک دفعہ اور بیٹے سے فون کر کے اُس سے پوچھ لو۔کہ وہ کیا چاہتا ہے۔پھر بے شک نغمہ طلاق لے کر گھر بسا لے۔تائی امان نے دل پر پتھر رکھ لیا۔آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو دامن میں جذب ہونے لگے۔تایا بھی افسردہ ہو گئے۔اچھا پتہ کرتا ہوں۔نغمہ بیٹی کہاں ہے؟ تایا نے اِدھر اُدھر دیکھا۔وہ اپنے کمرے میں ہے۔اپنے حالات پہ روتی رہتی ہے۔بیٹا بھی افسردہ رہتا ہے۔وہ آنسو صاف کرتے ہوئے بولی۔اُس لڑکے نے تو ہمیں کہیں کا نہیں رکھا۔تایا نے کسی نہ کسی طرح سے وسیم سے رابطہ کیا تو آگے سے جواب ملا جو مرضی کریں۔تم نغمہ کو طلاق دے دو۔ٹھیک ہے میں کاغذات دستخط کر کے بھیج دیتا ہوں۔وہ عدالت میں جمع کرائے اور خُلا لے لے۔تایا اور تائی کا تو دل ہی بیٹھ گیا۔کتنا مان تھا اُس کج بخت پر۔بڑھاپے کا سہارا ہوگا۔مگر کچھ نہیں۔

نغمہ نے طلاق لے کر نوکری کر لی بیٹے کو پڑھا لکھا کر اُس نے قابل کیا کہ وہ مان کا سہارا بنے۔باپ کی بے وفائی تو اُسے از بر تھی۔ماں کے کبھی نہ ختم ہونے والے آنسو اُس کے اندر اک آگ سُلگائے رکھتے۔یکے بعد دیگرے فاروق کے دادا دادی بیٹے کو سینے سے لگانے کی حسرت میں اس دنیا سے منہ موڑ گئے۔اپنا گھر فاروق کے نام کر گئے۔اور ایک دن اُس نے دادا کا گھر فروخت کر دیا۔اور ماں کو لے کر کراچی چلا آیا۔جہاں اُسے نوکری مل گئی تھی۔سارا دن وہ بیٹے سے وعدہ لیتی رہتی کہ وہ اپنے باپ کی طرح نہ کرے۔اور وہ ماں کے سر کی قسمیں کھاتا رہتا۔وقت نے نغمہ کا سر سفید کر دیا۔شادی کے بعد صرف ایک مہینہ شوہر کے ساتھ رہنے والی کو شوہر سے جدا ہوئے تیس سال ہو گئے تھے۔وہ دوسرا گھر بنا ہی نہیں سکی کہ دلوں میں گھر صرف ایک دفعہ ہی بنتے

ہیں۔ آج حسب معمول وہ جلدی گھر آ گیا تھا۔ اماں کدھر ہو؟ وہ ماں کو پکارتا پھر رہا تھا۔ نغمہ جائے نماز اُٹھا کر باہر آئی۔ آج اتنی جلدی۔ ہاں اماں آج ایک آدمی ملا۔ اتنا اُجڑا ہوا اور اُداس کہ کیا بتاؤں۔ وہ میرے آفس آ گیا تھا۔ ایسا لگا جیسے اپنا سب کچھ لٹا کر آ گیا ہو۔ اُسے نوکری کی ضرورت تھی۔ ایک بات پہ مجھے بہت حیرت ہوئی۔ وہ بار بار مجھے گھور گھور کر دیکھتا رہا۔ جیسے کچھ کہنا چاہتا ہو۔ پوچھنا چاہتا ہو۔ میرا نام پوچھا۔ ماں کا دادا کا نام پوچھا۔ اپنے گھر کا ذکر کیا۔ مگر میں نے زیادہ دھیان نہیں دیا۔ اچھا ہو گا کوئی۔ ایسے چیکنے والے لوگوں کو منہ نہ لگایا کرو۔ میں اُسے ایدھی شیلٹر ہومز میں چھوڑ کر آ گیا ہوں۔ وہ بار بار میرا ہاتھ پکڑ لیتا۔ اتنی اپنائیت کا اظہار کر رہا تھا۔ پہلے تو میں نے سوچا کہ گھر لے آتا ہوں۔ پھر مناسب نہ لگا۔ اچھا کیا بیٹا۔ اماں باپ کے زندہ ہونے کے باوجود آج تک زندگی میں اُس کی کمی محسوس کرتا ہوں۔ ہر بوڑھا آدمی باپ جیسا لگتا ہے۔ فاروق اُداس ہو گیا۔ اچھا سنو۔ وہ خالہ رضیہ بتا رہی تھی کہ دو تین رشتے ہیں اُس کے پاس۔ تم کہو تو بات چلاؤں۔ اب سُنا گھر اچھا نہیں لگتا۔ ٹھیک ہے ماں جو مرضی کرے۔ نغمہ بیگم خوش ہو گئی۔ اور پھر اُسے بیٹے کے لئے ایک لڑکی پسند آ گئی۔ گھر میں ایک رونق ایک ہنگامہ رہنے لگا۔ نغمہ کی اُداس زندگی میں کتنی بڑی خوشی آ گئی تھی۔ وہ سب غم بھول گئی۔ وقت گزرنے کا پتہ ہی نہ چلا۔ ایک دن فاروق کو ایدھی سینٹر سے فون آیا کہ وہ جس بزرگ کو داخل کروا کر گئے تھے وہ بستر مرگ پر ہیں اور آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ اچھا وہ حیران سا ہوا۔ او کے۔ میں آ رہا ہوں۔ وہ ایدھی سینٹر پہنچا تو بزرگ اُس کی راہ تک رہے تھے۔ جی بابا جی۔ وہ اُنکے پاس جا کھڑا ہوا۔ بابا جی! اُس نے کہا ہاتھ آگے بڑھاؤ۔ آگے کرو۔ فاروق نے ہاتھ آگے کیا تو ایک لفافہ اُس کی طرف بڑھا دیا۔ یہ تم رکھ لو۔ یہ کیا ہے فاروق نے حیرت سے پوچھا۔ بس تم رکھ لو۔ یہ میری خواہش ہے۔ تم میرے بیٹے جیسے ہو۔ یہ میری کہانی ہے۔ پڑھ لینا۔ اور سبق حاصل کرنا۔ جی ضرور۔ فاروق نے ہاتھ کیا تو بابا جی نے اُس کا ہاتھ چوم لیا۔ کان اِدھر کرو۔ وہ ہولے ہولے کانپ رہے تھے۔ اُن کے پاؤں ٹھنڈے ہو رہے تھے۔ میں اب نہیں جیوں گا۔ شائد یہ میری زندگی کے آخری لمحے ہیں۔ میں تمہیں پہچان گیا ہوں۔ اپنی ماں سے کہنا مجھے معاف کر دے۔ یہ میری آخری التجا ہے میرے بیٹے۔ میں ۔۔ میں وسیم ہوں۔ بدبخت وسیم۔ اس کے ساتھ ہی فاروق کے ہاتھ میں دبا اُن کا ہاتھ بے جان ہو گیا۔ کھلی آنکھیں فاروق پر جمی تھیں۔ وسیم اقدس اُس کا اپنا باپ جسے وہ کبھی باپ نہ کہہ سکا۔ ملا بھی تو اس کسمپرسی میں۔ ایدھی والوں نے کفن دفن کا انتظام کیا۔ ابھی رُکیئے فاروق نے ڈائریکٹر صاحب سے کہا۔ میں اپنی ماں سے پوچھ لوں۔ اُس نے فون ملایا۔ ماں! فاروق نے وسیم کی ساری کہانی کہہ سُنائی۔ میرے آنسو خشک ہو چکے ہیں۔ فاروق تم نے اپنا باپ دیکھ لیا ہے۔ تمہاری یہ حسرت پوری ہو گئی ہے۔ اب اُسے دفن کر آؤ۔ مجھ میں اُسے دیکھنے کا حوصلہ نہیں ہے۔ ٹھیک ہے۔ وسیم کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اُن کے دفن کے سارے اخراجات میں ادا کروں گا۔ ایدھی سینٹر والوں نے بڑی کوشش کی کہ اُس کا راز جان سکیں۔ یہ میرے بزرگ ہیں۔ مدتوں بعد اس حالت میں ملے ہیں۔ اللہ ان کی مغفرت فرمائے۔ مقامی قبرستان میں دفن کرنے کے بعد فاروق گھر آیا۔ تھکا ہو۔ ٹوٹا ہوا اور مرجھایا ہوا سا۔ ایک ٹھنڈی سانس کھینچی کہ وہ جلد ہی انسان اپنے انجام کو پہنچ جاتا ہے۔ میرا باپ بھی نجانے کیسے کیسے حالات سے گزر کر خاک ہو گیا۔ نغمہ بیگم نم ہوئی آنکھوں سے اُسے دیکھ رہی تھی۔ گھر میں سوگ کی کیفیت طاری تھی۔ جب بہو نے انہیں خوشخبری سُنائی۔ وہ ماں بننے والی ہے۔ ایک روح نے دنیا چھوڑی تو دوسری نے دنیا میں قدم رکھا۔ یہی نظام زندگی ہے۔ بس اس سٹیج پر ہر کوئی اپنا اپنا کردار ادا کرتا ہے اور چلا جاتا ہے۔ کوئی اچھا کوئی برا۔ گھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ نغمہ پرسکون تھی۔ اُس کی ساری بے قراری یک لخت ختم ہو گئی تھی۔ یوں لگا جیسے صدیوں کی تھکن نے اپنا راستہ موڑ لیا ہو۔ اچانک اُسے لفافے کا خیال آیا۔ اماں بابا نے ایک لفافہ دیا تھا۔ اُس نے جلدی سے لفافہ باہر نکالا۔ اُس میں ایک طویل خط تھا۔ نغمہ وسیم کے نام اور اس کے ساتھ دستخط شدہ چیک کی ایک کاپی اور کچھ دیگر کاغذات تھے۔ نغمہ خط پڑھنے لگی۔ بیٹے نے چیک بک دیکھی ایک کروڑ ڈالر کا چیک ساری زندگی گروی رکھنے کی قیمت تھی جو فاروق کے لئے اُس نے چکائی تھی۔ امریکہ میں اُس کی پراپرٹی بھی فاروق اور نغمہ کے نام تھی۔ مگر وہ اُس کے پاس اب بھی نہیں تھا۔

❁❁❁

واپسی

محمد شفیق پنوار/ حاصل پور

بس سے اتر کر ذیشان اسٹیشن میں ادھر ادھر آنے جانے والی بسوں اور گاڑیوں کا جائزہ لینے لگا کافی دیر سکتے کے عالم میں ٹھہرنے کے بعد اچانک سے ایک تیز آواز ہارن نے اسے چونکہ دیا اور وہ جیسے کسی دور ڈوبے ہوئے منظر سے واپس اپنے جسم کے قالب میں آگیا ہو اسی کیفیت میں اس نے کوئی لمحہ ضائع کیئے بغیر سامنے کی طرف چلنا شروع کر دیا۔ گاڑیوں کے شور، تیز ہارنوں اور لوگوں کے ہجوم میں اسے اپنا آپ اجنبی اور اس دھرتی پر بوجھ محسوس ہو رہا تھا۔

بے سمت چلتے چلتے اسے دور سڑک کے پار حد نظر تک کانٹے دار درختوں پر کچھ کوئے بیٹھے ہوئے دکھائی دیئے۔ جن پر غور کرتے ہوئے اسے یوں محسوس ہوا کہ جیسے یہ کوے دنیا و مافیہا سے آزاد کسی فکر سے پریشان نہیں ہیں۔ بلکہ مل جل کر آپس میں کائیں کائیں کرنا گویا انکا ایک دوسرے کے ساتھ حال احوال کرنا اور گپ شپ لگانا محسوس ہو رہا تھا اسطرح کوؤں کو ایک دوسرے کے ساتھ اڑتا اور اڑ کر ساتھ ساتھ درختوں پر بیٹھتا دیکھ کر نہ جانے کیوں اسکی تنہائی نے اس کے تنہا ہونے کے احساس کو مزید دو بالا کر دیا تھا۔ ذیشان نامعلوم سمت کی جانب چلتے چلتے جب تھک گیا تو اس نے سوچنا چاہا کہ آج کتنے دن ہو گئے ہیں اس کو گھر چھوڑے ہوئے مگر اسکی سوچ کام نہیں کر رہی تھی اور وہ بار بار اپنے دماغ پر زور ڈال رہا تھا اسی طرح سوچتے سوچتے ٹھنڈی ہوا نے تھکے ہوئے دماغ میں نیند کے ہلکے ہلکے پردوں میں ملا ایک عجیب تصور پیش کر دیا اور نہ چاہتے ہوئے بھی اسے کچھ وقت کیلئے سڑک کے کنارے بچھی فٹ پاتھ پر بیٹھنا پڑا۔ فٹ پاتھ پر بیٹھتے ہی ذیشان کو نہ صرف اپنے چھوڑے ہوئے گھر کی یاد آنے لگی بلکہ اسے اپنے گھر واپس جانے کی بھی کمی محسوس ہونے لگی اور وہ سوچنے لگا کہ جلد بازی میں اسکا گھر چھوڑنے کا فیصلہ شاید ٹھیک نہیں تھا اور اسے اپنے والد سے بحث و تکرار کے بعد اتنی معمولی باتوں کے اختلاف پر گھر نہیں چھوڑنا چاہیے تھا۔ وہ انہی خیالوں میں غلطاں تھا کہ ایک تیز رفتار موٹر سائیکل اور چنگی چی کے ٹکراؤ نے اسکی توجہ اپنی طرف کھینچ لی۔ موٹر سائیکل کے گرتے ہی ذیشان کی نظر ان دو سواریوں پر پڑی جو موٹر سائیکل سے نیچے آگری تھیں۔ لوگ بھاگ کر انکی طرف دوڑے اور انکو اٹھانے کی کوشش کرنے لگے اور کچھ چنگ چی والے کو برا بھلا کہہ رہے تھے موٹر سائیکل سے گرنے والے دو انسانوں میں ایک نوجوان اور دوسرا ادھیڑ عمر شخص تھا۔ نوجوان موٹر سائیکل کو ڈرائیو کر رہا تھا اور دوسرا بڑی عمر کا اسکے پیچھے بیٹھا تھا۔ ذیشان نے دیکھا کہ ادھیڑ عمر شخص کے بازوں اور ٹانگوں سے خون کے دھبے کپڑوں کو رنگین کر رہے ہیں۔ مگر وہ بار بار اپنے زخموں کی پروا کیئے بغیر نوجوان کے بارے میں پوچھ رہا ہے اور اپنی فکر کیئے بغیر انتہائی تکلیف کے عالم میں بھی اٹھتا ہے اور نوجوان جس کو بظاہر کوئی چوٹ نہیں آئی ہوتی اسکا حال احوال معلوم کرتا ہے لوگوں کے ہجوم اور موٹر سائیکل کے گرنے کے باوجود وہ بار بار اس ڈرائیو کرنے والے نوجوان کے آگے پیچھے گھومتا ہے اور پھر اپنے کندھے پر سے چادر اتار کر نوجوان کے کپڑوں کو جھاڑنا شروع کر دیتا ہے اور پھر آگے بڑھ کر اسکے ہاتھ کو پکڑ کر چوم لیتا ہے اور دونوں موٹر سائیکل کو اٹھا کر سامنے مکینک کی دکان پر لے جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ انکے چلے جانے کے بعد ذیشان کو پتہ چلتا ہے کہ موٹر سائیکل والے دونوں باپ بیٹا تھے اور پاس کے کسی گاؤں سے تعلق رکھتے تھے ان حالات میں ذیشان کو اس والد کا اپنے بیٹے کا بار بار پتہ کرنا اپنے ہاتھ پاؤں زخمی ہونے کے باوجود بیٹے کو چومنا ہر طرف سے اسکو نادان چھوٹے بچوں کی طرح سنبھالنا اور اپنے بہتے ہوئے خون کی پرواہ کیئے بغیر بیٹے کے کپڑے جھاڑنا نہ جانے کیوں اسکے اندر محبت پدری کے جذبے کو ابھار رہا تھا۔ ذیشان ان خیالات سے باہر آیا اور فٹ پاتھ سے اٹھ کر چلنا شروع کر دیا ابھی وہ کچھ دور ہی گیا تھا کہ اس کے پاؤں میں درد محسوس ہونا شروع ہو گیا وہ اب اس تکلیف کو برداشت کرتے ہوئے جلد سے جلد کسی ہوٹل میں پہنچ کر آرام کرنا چاہتا تھا مگر پاؤں کی تکلیف بڑھتی چلی گئی۔ جب کچھ دور چل کر تکلیف ناقابل برداشت ہو گئی تو اس نے سڑک کے کنارے پر بیٹھ کر اپنے پاؤں کا جائزہ لینا شروع کیا۔ جوتی اتارنے پر پتہ چلا کہ پاؤں کو جوتی میں لگی ہوئی کوئی بے ترتیب کیل تکلیف پہنچا رہی تھی تب اس نے سٹیشن سے باہر بیٹھے ہوئے موچی کو اپنی جوتی مرمت کیلئے دے دی موچی نے بتایا کہ یہ کیل تو جوتی کے اندر ایسے دھنسی ہوئی ہے جیسے پچھلے کچھ ماہ سے اسی حالت میں رہی ہو پھر جب اس نے غور سے اپنی جوتی کو دیکھا تو اسے معلوم ہوا کہ وہ غصے میں جلدی سے اپنے باپ کی پرانی جوتی پہن کر نکل آیا ہے اور اس سے ملتی جلتی اپنی نئی جوتی گھر چھوڑ آیا ہے اسی خیال کا آنا تھا کہ اسے وہ سب یاد آ گیا کہ جب پچھلے سال اس نے اپنے باپ سے لیدر کے کوٹ کا کہا تھا تو باپ نے اپنی نئی جاتی کا ارادہ ترک کر کے اسکو نیا کوٹ لے دیا تھا۔ پھر عید پر اسکے من پسند کپڑے اور جوتی تو خرید لی گئی مگر باپ نے اپنی جوتی وہی رہنے دی پھر اسے وہ قصہ بھی یاد آ گیا کہ کس طرح اس نے باپ سے ضد کر کے موبائیل فون خریدا تھا اور باپ نے اپنے نئے سوٹ اور جوتی کی پھر قربانی دے دی تھی بلکہ اسے تو یہاں تک بھی یاد آ گیا کہ جب ابو مزدوی سے واپس آ کر اس جوتی کے پاؤں کے اس حصے پر سرسوں کا تیل لگا تا تھا جو حصہ اب اس کے پاؤں کا کیل سے زخمی ہو چکا تھا اسطرح اب اسے احساس ہونے لگا کہ اس نے گھر چھوڑنے کا فیصلہ کر کے غلط کیا ہے ابھی تو اسے صرف چار ہی دن گھر کو چھوڑے ہوئے گزرے تھے۔

اور کئی دوستوں نے تو اسے اپنے پاس رکھنے سے معذرت بھی کر دی تھی جسکی وجہ سے اس نے شہر آنے کا فیصلہ کیا تھا یہی خیالات تھے کہ اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے اور وہ جوتی دوبارہ پہن کر اسٹیشن کی جانب واپس روانہ ہو گیا۔

افسانہ

احساس

انجینئر ظفر محی الدین/ لاہور

شدید تنہائی کے باوجود میں ایک مطمئن زندگی گزار رہی ہوں۔ وقت کے ساتھ بڑھتی عمر کا بھی مجھے کوئی افسوس نہیں ہے۔ اُس پر کیا افسوس کرنا ہے جو اختیار میں ہی نہیں اور جو ہونا ہے۔ چند بیماریاں جو مجھے لاحق ہیں اُن کا بھی ملال اس لیے نہیں ہے کہ جب میں اردگرد خود سے جڑے ہوئے افراد کو دیکھتی ہوں تو اُن میں سے کوئی بھی مکمل طور پر صحت مند دکھائی نہیں دیتا۔ اُٹھتے بیٹھتے اپنے مرحوم شوہر کے لیے دل سے دُعائیں نکلتی ہیں۔ رب کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے میرے لیے اتنی پراپرٹی چھوڑ گیا ہے کہ ان سے آنے والے کرایوں سے میں ہمیشہ خوش حال رہتی ہوں اور اُس میں سے خطیر رقم مستحق معذور بچوں کے علاج معالجے اور دیکھ بھال پر خرچ کرتی ہوں۔ اپنا زیادہ تر وقت بھی اُن بچوں کے درمیان گزارتی ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مجھے ہر بچے میں اپنا جگر گوشہ شہباز دکھائی دیتا ہے۔ شادی کے بعد جب دس سال تک کوئی بھی بچہ نہ ہوا تو ہم دونوں کس قدر مایوس ہو گئے تھے۔ کون سا علاج تھا جو ہم نے نہیں کیا تھا۔ کون سی منت تھی جو نہیں مانی تھی۔ اس سب کے باوجود شاخِ اُمید کی بہار برسوں پھولی مگر کبھی پھلی نہیں۔ ہمارے درمیان محبت رفتہ رفتہ خاموشی میں بدلتی گئی۔ گھر میں ہوتے تو ہم ایک دوسرے کو کم اور در و دیوار کو زیادہ دیکھتے تھے۔ ہم دونوں خود کو ایک دوسرے کا مجرم سمجھنے لگے تھے۔ اُوپر سے لوگوں کی دل جلانے والی باتیں سننا پڑتیں۔ بانجھ عورت کا طعنہ عورت کے لیے سب سے بڑی گالی ہے۔ بلدیہ کے الیکشن میں مخالف اُمیدوار نے میرے شوہر کو نامرد کہہ دیا تو وہ ٹوٹ کر رہ گیا اور اُس کے بعد ہمیشہ کے لیے سیاست چھوڑ دی۔ ہم چلتی پھرتی لاشیں بن کر رہ گئے۔ پھر اچانک میرے ماں بننے کی خبر نے اس طرح ہماری خوشیاں ہمیں واپس کر دیں جیسے برسوں کی بنجر زمین کو بارش سرسبز کر دے۔ ۹ ماہ کے عرصہ میں خوشی سے میرے پاؤں زمین پر نہیں ٹکتے تھے۔ اگر چہ اُردو محاورے کے مطابق وہ بھاری تھے۔ اس دوران میں اپنے شوہر کی آنکھوں میں بھی عجب چمک دیکھتی جس میں اُمید اور اعتماد تھا۔ اُس کی مردانہ وجاہت جو ماند پڑ گئی تھی دوبارہ آب و تاب دکھانے لگی تھی۔ بالآخر شدید انتظار کے بعد وہ گھڑی آ گئی جب میں نے شہباز کو جنم دیا۔ ہائے مقدر! شہباز کیا تھا ایک گوشت کا لوتھڑا تھا۔ وہ پیدائشی معذور تھا اور اُس کی معذوری کا کوئی علاج نہیں تھا۔ اس حادثے نے میری ماں بننے کی خوشی کو ایک ایسے دکھ سے جوڑ دیا جس کی کوئی انتہا نہیں تھی۔ یہی کیفیت میرے شوہر کی بھی تھی۔ وہ خوش قسمت تھا کہ چند ماہ بعد ہارٹ اٹیک سے چل بسا اور اس درد سے چھٹکارا پا گیا۔ میں بدقسمت تھی، زندہ رہی۔ میرا امتحان طویل تھا۔ میرے صبر کو آزمایا جانا تھا۔ رشتہ داروں نے ترس کھانے کے انداز میں ایسی باتیں کیں کہ میرا کلیجہ پھٹ کر رہ گیا۔ اس سے تو بہتر بانجھ پن کا دکھ تھا۔ جیسے جیسے وہ بڑا ہوتا گیا میرا امتحان کڑا ہوتا گیا۔ بازو اور ٹانگیں تو درکنار وہ گردن بھی نہیں ٹکا سکتا تھا۔ اُس پہ ظلم یہ کہ وہ ذہنی طور پر معذور نہیں تھا۔ ہر بات سوچتا اور سمجھتا تھا۔ گلاب جیسے چہرے پر جھیل جیسی آنکھیں دے کر جیسے قدرت نے اُس کی معذوری کی تلافی کرنے کی کوششیں کی تھی۔ جب اُس کے چہرے پر نظر ٹکتی تھی وہ دنیا کا سب سے حسین بچہ دکھائی دیتا تھا۔ میں تو ماں تھی میرے علاوہ بھی سب کا یہی کہنا تھا۔ پہلے پہل مجھے اُن جملوں سے بڑی تکلیف ہوتی تھی جو شہباز کی بیچارگی اور معذوری کے حوالے سے ہر آشنا، نا آشنا بولتا تھا۔ وہ کچھ یوں ہوتے تھے: ''ہائے! کتنا معصوم اور پیارا بچہ ہے۔ رب کے کام رب جانے، پتہ نہیں کیوں معذور پیدا ہو گیا۔' 'ہائے! کیا ہوا بیچارے کو، کتنی معصوم شکل ہے۔ استغفار! میرے اللہ توبہ ہے توبہ، کسی ماں کو رب ایسا دکھ نہ دے۔'' ''میرے مولا رحم! آنکھیں اور شکل تو دیکھو، فرشتہ لگتا ہے۔ کیا گزرتی ہوگی بے چاری ماں پر، کیسے سنبھالتی ہوگی۔ اللہ معاف کرے۔'' بعد میں رفتہ رفتہ میں ان جملوں کی عادی ہو گئی۔ باہر شہباز کے ساتھ جانا کسی عذاب سے کم نہ تھا۔ ہر شخص نے کوئی نہ کوئی جملہ ضرور پاس کرنا ہوتا تھا۔ کوئی کہتا: ''یہ ماں باپ کے کرموں کا نتیجہ ہے۔'' یہ سن کر کلیجہ چھلنی ہو جاتا۔ کوئی کہتا ''ایسے بچے تو بہشتی ہوتے ہیں، ان کے ماں باپ تو پکے جنتی ہوتے ہیں۔'' ایک ماں کو بچے کے حوالے سے جنت کا لالچ ہوتا ہے نہ دوزخ کا ڈر۔ وہ تو بس اپنے لختِ جگر کو دیکھ دیکھ کے خون کے آنسو روتی ہے۔ میرا بھی یہی حال تھا۔ شہباز کی خوب صورت آنکھوں میں ان گنت سوال ہوتے تھے۔ ان میں سے کسی سوال کا جواب میرے پاس نہیں تھا۔ وہ اشاروں سے اپنے اندر کی کیفیت سمجھانے کی بھرپور کوشش کرتا۔ مگر اُس کے ایسا کرنے سے ہاتھ پاؤں مڑ جاتے۔ وہ درد سے کراہتا۔ اُسے فٹز پڑتے تھے جس کے لیے اُسے ڈھیروں ڈھیر دوائیاں روزانہ پینی پڑتی تھیں۔ میں یہ دوائیاں پلاتے ہوئے اور وہ پیتے ہوئے نڈھال ہو جاتے تو ایک دوسرے کے گلے لگ کے خوب ہنستے۔ ان قہقہوں میں ہماری کرلاہٹ بھی شامل ہوتی تھی۔ اُس کو کچھ بھی کھلانا یا پھر واش روم لے جانا دونوں جان لیوا مراحل تھے جن میں سے مجھے صبح و شام گزرنا ہوتا تھا۔ میری زندگی اُس پل صراط سے ہوتے گزر رہی تھی۔ اس عرصہ کے دوران میں اپنا آپ مکمل فراموش کر چکی تھی۔ میں جو کبھی ماڈرن لڑکی ہوا کرتی تھی لڑکیاں میرے فیشن کی کاپی کیا کرتی تھیں۔ اب جوتے کپڑے تو درکنار مجھے یہ بھی نہیں خبر ہوتی تھی کہ کون سا موسم ہے۔ جب وہ پانچ سال کا ہوا تو اُسے سنبھالنا میرے لیے مشکل ہو گیا۔ چھٹے سال کا ہوا تو کئی بار اُسے اُٹھا کر چلتے ہوئے میں گھر میں گر پڑی۔ جس سے اُسے اور مجھے چوٹ آئی۔ اب میں اس اذیت ناک زندگی سے تنگ آ گئی تھی۔ وقت پر اُسے دوائی نہیں دیتی تھی۔ کھانا بھی وقت پر نہیں کھلا پاتی۔ وہ اپنے گلے سے مختلف آوازیں نکال کے خوب صورت آنکھوں سے مجھے بلانے کی کوششیں کرتا رہتا اور میں بیڈ پر لیٹی چھت کو یونہی بے مقصد تکتی رہتی۔ اب مجھے اُس سے زیادہ خود پر ترس آتا تھا۔ شاید اسی لیے خدا نے بھی مجھ پر ترس کھایا اور ایک دن شہباز میری طرف خوبصورت آس بھری آنکھوں سے دیکھتے دیکھتے اللہ کو پیارا ہو گیا۔ میں گھر کے کاموں میں مصروف رہی۔ ڈاکٹر نے بتایا اس کی ڈیتھ کئی گھنٹے پہلے ہو چکی ہے۔ وہ باہر صحن میں لیٹا تھا۔ اُس کی آنکھیں کھلی تھیں۔ جیسے آسمان کو تک رہی تھیں۔ شہباز جب بھی یوں آسمان کو تکتا مجھے یوں لگتا جیسے وہ لمبی اُڑان بھرنا چاہتا ہے۔ آج اُس نے لمبی اُڑان بھر لی تھی۔ اس اُڑان نے مجھے اُس کی ذمہ داریوں سے آزاد کر دیا تھا۔ میں شاید دنیا کی واحد ماں تھی جسے اپنے بیٹے کے مرنے کے دکھ کے ساتھ انجانی فرحت کا احساس بھی تھا۔

Amir Bin Ali and "Sakura & Spice"

Abdul Waheed Bismil

Received the heart touching Travelogue"Sakura Spice "written by a renowned writer and a internationally known Pakistani poet living in Japan for more than a decade–Mr. Amir Bin Ali through one of my loving friends and a prominent literary figure of Lahore-Mr. Hassan Abbasi . Although, it is a bit difficult to go through a book now a days as there are hundreds and thousands of books written in a casual manner and stereo style and a reader could pay his maximum attention up to a few pages only. But, if the starting ingredients of a book are showing some importance, the book definitely attractsthe reader who will try to read it out from start to the end. And same was the position of mine while going through this travelogue. There were numerous parts of the said book that not only attracted me to read but created a whish and will to know Japan in its different eras of development, its people, their habits, manners, the way of life, their spiritual, s o c i a l , cultural, political, economic and aesthetical values in detail but with a charm of noticing and analyzing a fascinating style of writing in a foreign language.

The matter that captured my attention was the light and simple way of telling the values, customs and rituals of a society and that too, through a person, who knows all about that but disseminates the most attractive and important information, keeping in view, the need of the readers and not to show his own literary knowledge, skills and command over the subject. So, I tried to read it out and that took my two consecutive d a y s . But it was a pleasant experience to go through the contents of the"SakuraSpice."

Coming to the crux of my knowledge attained after having gone through the said book, It is fascinating to learn that the writer has paid his utmost attention with extreme devotion and justified to write a travelogue, not only foxing upon a certain city, place or a portion thereof but the entire Japan stands focused in the book.The book started with a prime habit of the Japanese that as per their social value and custom, they do not use the word " N O" barely, but have some proper and most appreciated manner to say" yes "first andthen try to let the opponent understand the " N O)" with some gesture (hidden behind their usual"YES."Here, I realized our own tradition and a common way of a good conversation saying" jeeNaeen ."Soon after, the book took me to a custom of the Japanese Society relating to the brokenutensilsas they do not throw out the cracked utensils but try to get the same repaired with a joint of a precious metal like G o l d , Silver or platinum. This repairing further relates to build up the broken relations of friendship or fellows apart from the domestic binding.

The writer further elaborated the most unwanted habit of the people which is, although, condemned all over the world yet common every-where and that is the "Bagging" but you can't explore any bagger in Japan. Another social value of that society has also been mentioned that a customer is not supposed to hand over the money to the shop keeper over their hands but one had to keep it in a small tray available at the shops/counters and the same is taken by the sales men or the shop keepers accordingly .Likewise, there is no trend of paying Tips to the waiters at any restaurant or hotel in that country. The book further tells us about the living manners of the Japanese that there are about 126 million people living in the country but you will never see any place without proper sanitation. Nobody is allowed to throw anything that becomes a part of garbage on the roads, parks and any other public place. More over the sanitary workers perform their duties round the clock where needed and thus a clean and beautiful society and its country can been seen by everyone. There is another interesting resemblance with our ancient tradition and that is to take off the shoes at the entrance of the house or the place of worship. That is also catching the heart.

Aesthetic sense is always known as a symbol of sophistication of a person or the society at large. Exploring this aspect of life, the writers'tells that the Japanese have this sense up to an extreme, that's why they enjoy

and celebrate the blooming season of the Cherry Blossom as a festival called" Hanami ."Cherry Blossom is their National flower and during its blooming most of the people including elderly women enjoys the flowery scene while this flower is also known as the symbol of purity and piousness. They have their own name "Sakura" for the cherry Blossom in their local language. The writer had rightly selected the title of the book taking out this name from their most liked and lovely articles. The book also tells that the Japanese are deadly respecting the scientists and the researchers as they recognize Thomson Edison, the inventor of the Electric bulb as the god of Light .In this chapter the writer has also explained in detail about the properties of the Bamboo Tree which was primarily used in the filament of the Electric Bulb by its inventor. The most interesting discussion in this chapter relates to the great Muslim thinker and poet Maulana Room who wrote the Masnavi and discussed the importance of the Bamboo relating to the flute which is made up of Bamboo wood .Going further Mr. Amir bin Ali depicted a beautiful face ofPhilosophical work carried out by our National poet Sir Allama Muhammad Iqbal and spreading among the people of Japan by virtue of their Educational system arranging a suitable environment for the teachers and the scholars. For this purpose Urdu Departments are working at three Universities of Japan where a lot of work had been done on Allama Mohammad Iqbal and his thoughts. It is also learnt via this travelogue that "Iqbal Day" is celebrated over there.

The writer also discussed some thoughts and theories like Revolution verses evolution along with the impact of Russian Bolshevik Revolution over the country. Similarly the fear of the Europeans of colonization and the Japan remained blocked for the incomers and the out goings. This trend delayed the industrialization but when this nation capture the way, moved so fast that surpassed many of the big Industrialized nations of the world..That shows the hard working nature of the Japanese. The author further indicated that there is great love for the work man but no attention or respect for the idle ones. A strange story of a jobless person is also narrated in the book who buys a truck, not for any loading purpose but just to show his neighbor that he is on job . Another interesting aspect of that society is read in the book that the Science of Love is being taught in the educational Institutions as a subject where interested student get admission and learn the antiquates of proposing/liking someone for the marriage purpose. What a society where nobody can touch the other even men do not shake hand with each other. But a good sign of that society is also there that is of a smiling face. Every one has to portray a smile over his/her face while working anywhere or conversing to anyone. Here the writer very importantly mentioned the Hadith of our Holy Prophet Hazrat Muhammad(peace be upon Him(that just smiling for a fellow Muslim is a charity. The book also tells about religious freedom for the Muslims in the country, the Mosques and the relaxation during the month of Ramadhan.

Mr. Amir has written this Travelogue in such a manner that each and every section of the life has been covered in the book whether it relates to the spiritual thoughts of the Japanese, the outcome of the world war–II, aftermath of the atomic bombardment- where"little boy" and the " Big man "were thrown over Hiroshima and Nagasaki, the ratio of high suicides, the dream of a girl for Green Roses , decreasing population, Halal Nail Polish, My Bag Challenge, story of a back packed Journalist ,Stone Garden and Month of August associated with the memories of the war and the atomic explosion, Invention of QR Code, Drone delivery of the News Papers , world Tallest Tower) sky Tree Technological Miracle, the customs of Royal Family marriages, G-20summit ,the Secrets of Prosperity ,and in short what about Japan, that is not mentioned in this book.

The writer is fully aware of his work and knows the need of the readers and the literary componentsof a travelogue, so this book can be termed as a reference book to Japan for the travellers, traders and the visitors apart from a valuable addition in the English Literature of our home land. Amir bin Ali really deserves heartiest and profound congratulations on publication of such a remarkable book .

ادبی خبریں

☆ اکادمی ادبیات پاکستان کے زیر انتظام قومی تقریب تقسیم اعزازات 11 تا 13 جون 2024ء کو اسلام آباد میں منعقد ہوئی جس میں گزشتہ سات سالوں کے کمال فن ایوارڈز اور بہترین کتابوں کے قومی ادبی ایوارڈ حاصل کرنے والوں کو سندات و اعزازات پیش کیے گئے۔

☆ اکادمی ادبیات پاکستان کے کتب خانے اور عجائب گھر کے لیے قلمی نسخوں، مخطوطوں اور نادر کتب کے حصول کے لیے مشاورتی اجلاس میں جن ماہرین مخطوطہ شناسی نے شرکت کی ان میں ڈاکٹر معین الدین عقیل، ڈاکٹر سفیر اختر اور ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد شامل تھے۔ اجلاس صدر نشین اکادمی ادبیات پاکستان ڈاکٹر نجیبہ عارف کے دفتر میں منعقد ہوا۔ جس میں ڈائریکٹر جنرل سلطان ناصر ڈپٹی ڈائریکٹر محمد عاصم بٹ اور مدیر اردو اختر رضا سلیمی بھی شریک ہوئے۔ اجلاس میں پاکستان کی تمام زبانوں کی علمی و ادبی ورثے کی حفاظت پر زور دیا گیا۔

☆ ادب سرا کے زیر اہتمام نعتیہ مشاعرہ ویژن اکیڈمی نزد ایمپوریم مال جوہر ٹاؤن لاہور میں منعقد ہوا۔ صدارت جناب واجد امیر نے کی۔ نظامت کے فرائض توقیر عباس توقیر نے ادا کیے۔ جن شعرائے کرام نے اپنا کلام پیش کیا اُن میں اظہر عباس خان، وسیم عباس، سید فیصل اکرم گیلانی، سلطان محمود ہاشمی، محمد علی صابری، ڈاکٹر فخر عباس، ڈاکٹر عدنان خالد، محمد افضل ساجد، عدنان خالد و دیگر شامل تھے۔

☆ 11 جون 2024ء کو ممتاز نعت گو شاعر، نعتیہ شاعری کے اوّلین نقاد اور سچے عاشق رسولؐ رشید وارثی کی برسی کے موقع پر ایک بہت اہم اور خوب صورت پروگرام ''رشید منہی'' بہادر یار جنگ اکیڈمی میں منعقد کیا گیا۔ جس کا اہتمام نعت ریسرچ سینٹر، سیّد صبیح الدین رحمانی اور طارق بن آزاد نے کیا۔

☆ بزمِ پرنم کے زیر اہتمام معروف شاعر پرنم الٰہ آبادی کی یاد میں پندرہویں سالانہ تقریب کا انعقاد کیا گیا۔ جس میں مختلف طبقہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والی نمایاں شخصیات نے شرکت کی اور اپنے انداز میں پرنم الٰہ آبادی کو خراجِ تحسین پیش کیا۔ صدارت جسٹس (ر) نذیر احمد غازی نے کی۔ جبکہ مہمانانِ خصوصی میں نامور فلم ڈائریکٹر سیّد نور اور مقبول و معروف شاعر حسن عباسی تھے۔ دیگر مہمانانِ اعزاز میں سیّد محسن گیلانی، راشد محمود، معروف صحافی زوہیب سلیم بٹ، معروف ادیب ڈاکٹر سیّد قمر علی زیدی، ایم جمیل شیخ، ریاض احمد ھمیم، نامور اُستاد شاعر اقبال راہی شامل تھے۔ پنجابی کمپلیکس قذافی اسٹیڈیم میں ہونے والی اس تقریب میں نظامت کے فرائض پروفیسر سلطان منیر نے احسن طریقے سے سرانجام دیے۔ اس موقع پر مہمانان اور حاضرین نا ے بانی و چیئر مین بزمِ پرنم، اقبال پیام کی کاوشوں کو سراہتے ہوئے خراجِ تحسین پیش کیا۔ مختلف شخصیات کی دستار بندی و تقسیم ایوارڈ کے بعد نامور گلوکار اُستاد حامد علی خاں نے اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہوئے تقریب کو چار چاند لگا دیے۔ آخر میں بزمِ پرنم کی طرف سے اُستاد حامد علی خاں کی تاج پوشی کی گئی۔

☆ حلقہ ارباب ذوق لاہور کا عید مشاعرہ پاک ٹی ہاؤس لاہور میں منعقد ہوا۔ اس شعری نشست کی صدارت جناب نذیر قیصر نے کی۔ جناب اشرف جاوید اور محترمہ حمیدہ شاہین نے بطور مہمانِ خصوصی شرکت کی۔ جن شعرائے کرام نے مشاعرے میں اپنا کلام سنایا ان میں عباس مرزا، ناصر بلوچ، عرفان صادق، جاوید قاسم، ممتاز راشد لاہوری، مختار کھرل، آفتاب جاوید، ڈاکٹر صغیر احمد صغیر، شوکت ناز، محترمہ روبینہ شاہین و دیگر شامل ہیں۔ سیکرٹری حلقہ ارباب ذوق محمد نواز کھرل نے نظامت کے فرائض سرانجام دیے۔

☆ بزمِ علم وفن پاکستان (ہزارہ) کے زیر اہتمام لاہور سے تعلق رکھنے والے معروف شاعر جناب سیّد جاوید کے شعری مجموعے ''رنگ ڈھلتی شام کے'' کی تقریب پذیرائی ماڈرن ایج پبلک اسکول و کالج (گرلز کیمپس) ایبٹ آباد میں منعقد ہوئی جس کی صدارت نامور بزرگ شاعر سلطان سکون نے فرمائیا۔ نظامت کے فرائض عبدالوحید بسمل نے ادا کیے۔ کتاب کے حوالے سے معروف شاعر جناب امتیاز الحق امتیاز نے پر مغز مقالہ پیش کیا۔ معروف شاعر اور ماہر تعلیم واحد سراج نے سیّد جاوید کے شعری سفر پر عمدہ گفتگو کی۔ سیّد جاوید نے اتنی شاندار تقریب کے انعقاد پر شکریہ ادا کیا۔ صاحب صدر سلطان سکون نے خطبہ صدارت میں سیّد جاوید کے ساتھ دیرینہ رفاقت کے حوالے سے عمدہ خطاب فرمایا۔

CamScanner

صابر ظفر تو نے یہ کیا کر دیا ہے

اسلام عظمی/لاہور

خزانہ ہائے غمِ دہر کے فقیر کے حوالے سے)

زندگی کیا ہے! یہ سوال اتنا ہی پرانا ہے جتنی کہ زندگی۔ زندگانی کی حدود کیا ہیں! غمی کیا ہے اور خوشی کسے کہتے ہیں۔ صابر ظفر کا تازہ شعری مجموعہ ''خزانہ ہائے غمِ دہر کے فقیر'' زندگی کے ایسے المیے کے بارے میں ہے جس کے بارے میں بات کرنا تو کجا سوچنا بھی ممنوع کے زمرے میں آتا ہے۔

965ء میں عباسی دور میں بغداد ایک شاعر متنبّی پیدا ہوا۔ عربوں میں آج بھی یہ نام جانا پہچانا ہے۔ متنبّی کا کلام آج بھی ذوق وشوق سے پڑھا جاتا ہے۔ مگر اُس نے مجرد زندگی گزاری۔ اُس کا کہنا تھا کہ اگر میرے والدین نے مجھے پیدا کر کے ظلم کیا ہے تو میں ایسا کیوں کروں۔

''خزانہ ہائے غمِ دہر کے فقیر'' کی غزلوں کی قرأت نے مجھے چونکا دیا۔ پھر دھیان کتاب کے انتساب کی طرف گیا۔ ورق ورق دُکھوں کا ایسا تسلسل ہے کہ مجموعہ پڑھ چکنے اور پرے رکھ دینے کے بعد بھی بازو تھامے رکھتا ہے۔ اُردو غزل کا اپنا ایک اسلوب ہے۔ کبھی غزلِ مسلسل ہے تو کبھی دو غزلہ اور سہ غزلہ۔ میری نظر سے آج تک ایسا کوئی شعری مجموعہ نہیں گزرا تھا جو ''خزانہ ہائے غمِ دہر کے فقیر'' کی طرح ایک ہی احساس کی ایک ہی رَو لیے ہوئے ہو۔ مجموعے کی ساری غزلیں ایک ہی موضوع کا احاطہ کرتی ہوں۔ دکھ ہر غزل میں بولتا ہو اور اُس کا اظہار ہر مصرع سے ہو۔

یادش بخیر! پچھلی صدی کی ساتویں دہائی میں حلقہ اربابِ غالب لاہور میں صابر ظفر سے میری جان پہچان ہوئی۔ اُس کا یہ شعر جیسے دل میں کھُب گیا۔ آج بھی اس شعر کی چبھن برقرار ہے۔

ڈول جائیں گے ترے بازو ترازو کی طرح
اور تیرے سامنے میں نیلام ہو جائیں گے ہم

شعر یاد ہو گیا اور یہ مقولہ سچ کہ سچا شعر وہ جسے رٹّا لگانے کی ضرورت نہ پڑے۔ شعر از خود یاداشت کا حصہ بن جائے۔ روحی کنجاہی اور صابر ظفر زرعی ترقیاتی بنک لاہور کے ادبی رسالے ''سرزمین'' سے منسلک تھے۔ حلقے کے علاوہ بنک سکوائر کی طرف جاتا تو صابر ظفر سے ملاقات ہو جاتی۔ صابر ظفر کم گو تھا۔ میں ملک سے باہر چلا گیا تو ملاقاتوں کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ مگر اس کا شعر ذہن سے چپکا رہا۔ لاہور کے دوستوں کا تذکرہ چھڑتا تو میں صابر ظفر کا متذکرہ شعر ضرور سناتا۔ کوئی چار سال پہلے ایک قریبی عزیز کی شادی میں شرکت کے لیے کراچی گیا تو ایک دوست سے صابر ظفر کا فون نمبر مل گیا۔

صابر ظفر کو فون کیا تو اُس نے ملاقات کے لیے آرٹس کونسل میں یوم پاکستان کے مشاعرے میں آنے کا کہا اور پھر میرا نام بھی مدعو شعرا کی فہرست میں لکھوا دیا۔ مگر جس روز مشاعرہ تھا' اسی روز شادی کی تقریب تھی۔ نہ تو میں مشاعرے میں شرکت کر سکا اور نہ ہی صابر ظفر سے مل سکا۔

پھر محمد ظہیر بدر نے اپنے گھر مقام دوست مصطفےٰ ٹاؤن میں صابر ظفر سے ملاقات کے لیے چند دوستوں کا اکٹھا کیا۔ یوں چالیس برسوں کے بعد صابر ظفر سے مری ملاقات ہو گئی۔ فرمائش پر بھی اُس نے اپنا باسی یا تازہ کلام نہیں سنایا۔ بات چیت میں بھی اُس نے کم ہی حصہ لیا۔ کچھ ماہ بعد مجھے علم ہوا کہ فرحت پروین اور صابر ظفر دونوں اپنے اپنے بیٹوں کی ناگہانی اموات کا صدمہ جھیل چکے ہیں۔ کچھ دُکھ کبھی نہ مٹنے والے ہوتے ہیں۔ موت اٹل سچائی ہے۔ کوئی آمد تو رک سکتی ہے مگر روانگی نہیں۔

خزانہ ہائے غمِ دہر کے فقیر......جس انسانی دُکھ کی طرف اشارہ کرتی ہے' اُس کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔ کوئی خود کو کچھ بھی سمجھے مگر بے بسی پر اُس کا کوئی بس نہیں۔ بہت سے معاملات افراد کے ہاتھ میں نہیں۔ راضی بہ رضا رہنے کے علاوہ کوئی بھی چارہ نہیں۔ صابر ظفر کے شعری مجموعہ ''خزانہ ہائے غمِ دہر کے فقیر'' کا پی ڈی ایف مجھے ملا تو میں نے اپنی سہولت کے لیے اُس کا پرنٹ نکال لیا۔ میں چالیس سال والے پرانے صابر ظفر سے ملنا چاہتا تھا مگر میں جوں جوں صفحات اُلٹتا گیا' چپ گہری ہوتی گئی۔ زندگی المیوں سے عبارت ہے۔ کچھ ایسے نا قابلِ برداشت بھی اور نا قابلِ بیاں بھی ہیں۔

پھر ارژنگ کے 2023 کے نومبر کے شمارے میں صابر ظفر کے اِسی مجموعہ کی کچھ غزلوں نے دستک دی۔ آگے بڑھنے سے پہلے ''خزانہ ہائے غمِ دہر کے فقیر'' کی پہلی غزل دیکھیں۔

خزانہ ہائے غمِ دہر کے فقیر ہیں ہم
قفس نظر نہیں آتا مگر اسیر ہیں ہم

یہی ہے صورتِ احساں، ہمیں مٹا دے وہ
کہ جس کے ہاتھ کی کھینچی ہوئی لکیر ہیں ہم

ہمارے عشق کے اطوار ہیں ہوس کا شکار
حقیر لگتے ہیں یا واقعی حقیر ہیں ہم

روگ مجسم ہو اور نوحہ متشکل تو......انھیں کوئی نام دیا ہی نہیں جاسکتا۔ پہلی سطر سے لے کر آخری سطر تک چیخ ہی چیخ۔ چپ بھی چیخ صدا بھی چیخ۔ مصرعے بھی چیخ۔ کوئی کیا بات کرے! روگ کا علاج بھی روگ۔ متنبّی یاد نہ آئے تو کون یاد آئے۔ ایک اور غزل دیکھیے۔

یہ زندگی تو معلق ہوئی اندھیرے میں
کوئی زمیں ہے کہاں اور آسماں ہے کہاں

گزر رہی ہے حیات اک عذاب کی صورت
اگر خموش ہوں میں، میرا ترجماں ہے کہاں

تیسری غزل دیکھتا ہوں۔

کرتا نہیں پسند کوئی سوچنا جسے
ایسے کسی خیال سے موسوم ہم ہوئے

ہر پل قدم سفر میں تھے، منزل کہیں نہ تھی
آوارگانِ خواہشِ موہوم ہم ہوئے

غزل کا ایک مفہوم یہ ہے کہ ذبح کے وقت غزال کے حلقوم سے نکلنے والی آواز یا پھر بے جان صحرا میں زندگی تلاشتا ہوا غزال۔

صابر ظفر تو نے یہ کیا کر دیا ہے!

CS CamScanner

نئی نسل ادب تو کیا اپنی تمام سابقہ روایات واقدار سے یکسر دور ہوگئی ہے

معروف نظم گو شاعر اور نقاد

ارشد معراج

سے معروف شاعرہ، کالم نویس اور

مدیرہ ارژنگ **لبنیٰ صفدر** کا مکالمہ

زمانہ جس قدر پیچیدگی کا شکار ہے اس کا اظہار صرف نظم میں ہی ہوسکتا ہے

سوال: اپنے بارے میں تفصیل سے قارئین کو بتایئے قلمی سفر کا آغاز، آپ کا پیشہ اور شعری سفر کا آغاز کب، کیسے اور کیوں ہوا؟

جواب: میرا دستاویزی نام ارشد محمود آصف اور قلمی نام ارشد معراج ہے میں 18 مارچ 1965 کو پھلروان ضلع سرگودھا میں پیدا ہوا۔ موجودہ مستقل سکونت راولپنڈی میں ہے۔ 1980 میں اپنے آبائی قصبہ پھلروان کے گورنمنٹ ہائی سکول سے میٹرک کیا۔ 82-1981 میں گورنمنٹ کالج آف کامرس سرگودھا میں ڈی کام میں داخلہ لیا لیکن بعض نامساعد حالات کے سبب امتحان نہیں دے سکا، 1987 میں ڈی کام کا امتحان پاس کیا۔ بی اے کا امتحان پرائیویٹ امیدوار کے طور پر پنجاب یونیورسٹی لاہور سے فرسٹ ڈویژن میں 1991 میں پاس کیا۔

ایم اے اردو کا امتحان پرائیویٹ امیدوار کے طور پر اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور سے 1994 میں پاس کیا۔ 2005 میں پی ایچ ڈی کے لیے ایچ ای سی کا سکالرشپ جی آر ای کا ٹیسٹ پاس کر کے حاصل کیا اور نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز اسلام آباد سے ڈاکٹر رشید امجد کی زیر نگرانی مقالہ بعنوان ''اردو افسانے میں آزادیٔ اظہار کے مسائل'' کے موضوع پر لکھ کر 2009 میں ڈگری حاصل کی۔

میں نے 1986 تا 1997 کلرک کی حیثیت سے علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد میں ملازمت کی۔ 1997 تا 2011 بحیثیت لیکچرار اردو گورنمنٹ ڈگری کالج کہوٹہ راولپنڈی میں پڑھایا۔ 2011 تا حال بحیثیت اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اردو انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد میں فرائض سرانجام دے رہا ہوں۔

شاعری کی ابتدا 1982 میں کی، ہمارے قصبے میں سکول کے استاد اور واحد شاعر شوکت راز صاحب تھے انہیں دیکھ

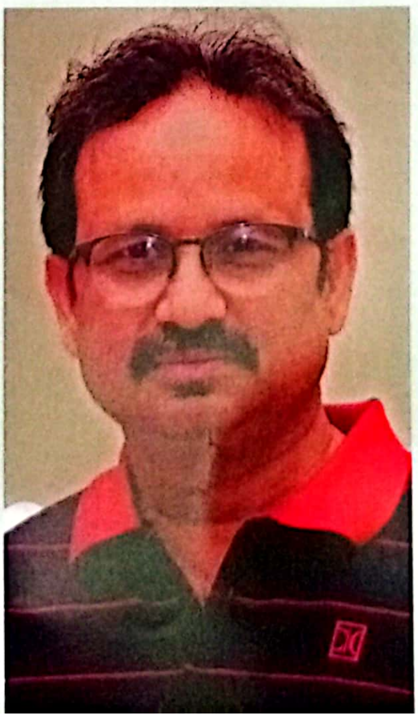

کر شوق پیدا ہوا اس دور میں میرے کلاس فیلوز افضل گوہر راو اور رانا سعید دوشی تھے ان کی صحبت میں شعر کہنا شروع کیا لیکن یہ دور روایتی سی شاعری کا تھا جسے تلف کر دیا، شاعری کا باقاعدہ آغاز اسلام آباد آنے کے بعد 1989 میں نظم سے کیا، یہاں جو دوست بنے وہ تمام نظم نگار تھے روش ندیم، داود رضوان (مرحوم)، سعید احمد، تابش کمال یہ سب نظم لکھتے تھی انہی کی صحبت میں نظم لکھنا شروع کی۔ مجھے اعتراف کرنے میں کوئی عار نہیں کہ نظم کی ابتدائی تربیت داود رضوان نے کی پھر ڈاکٹر وزیر آغا اور انوار فطرت سے بھی بہت کچھ سیکھا۔ صلاح الدین درویش نے میری علمی و ادبی و نظریاتی تربیت میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ اس زمانے میں تربیت کا ادارہ حلقہ ارباب ذوق راولپنڈی تھا جہاں ڈاکٹر رشید امجد، یوسف حسن، ڈاکٹر نوازش علی، جلیل عالی، ڈاکٹر سرور کامران، انوار فطرت، علی محمد فرشی، پروین طاہر اور صلاح الدین درویش حلقے میں باقاعدگی سے شامل ہوتے تھے ان کی گفتگو اور مباحث نو آموزوں کے لیے مشعل راہ ہوا کرتی تھی۔ ادھر حلقہ ارباب ذوق اسلام آباد میں منشا یاد، اقبال آفاقی، وقار بن الٰہی، محمد حمید شاہد کی ادبی و تنقیدی مباحث ذہنوں کو سیراب کر رہے تھے۔

بقیہ اندرونی صفحات پر

CamScanner

قاسم علی شاہ فاؤنڈیشن کے زیرِ اہتمام

ممتاز مزاح نگار، شاعر، ادیب، کالم نویس اور اینکر گلِ نوخیز اختر کے

شہرہ آفاق مزاحیہ ناول ٹائیں ٹائیں فش کی تقریبِ پذیرائی

گلِ نوخیز اختر

گلِ نوخیز اختر نے اظہارِ خیال کرتے ہوئے تقریب کو کشتِ زعفران بنا دیا

نظامت: ڈاکٹر عائشہ عظیم

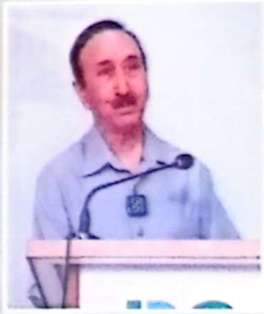

قاسم علی شاہ کے علاوہ حسین شیرازی، مرزا یٰسین بیگ، علی عباس، ابوبکر اور عبدالباسط نے بھی خطاب فرمایا

صدارت: ظہیر سید

تقریب میں اہلِ قلم کی کثیر تعداد نے شرکت فرمائی

مہمان خصوصی: عامر بن علی

پاکستان کے اہم کتب خانوں کے علاوہ ای۔کامرس کی تمام اہم عالمی ویب سائٹس پر دستیاب ہے۔

براہ راست منگوانے کے لیے رابطہ کریں

نستعلیق Publications

غزنی سٹریٹ • اردو بازار • لاہور
0300-4489310 - 0331-4489310
nastalique786@gmail.com

Read Arxang online
www.amirbinali.com
www.millat.com